مزاحمت کے اظہاریے: شہناز شورو کے افسانوں میں نسائی مزاحمت کے عناصر کا مطالعہ

مقالہ

برائے ایم۔فل (اردو)

مقالہ نگار:

طاہرہ ناہید

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۲ء

مزاحمت کے اظہاریے: شہناز شورو کے افسانوں میں نسائی مزاحمت کے عناصر کا مطالعہ

مقالہ نگار:

طاہرہ ناہید

یہ مقالہ

ایم۔فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۲ء

© طاہرہ ناہید

مقالے کی دفاع کی منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: مزاحمت کے اظہاریے: شہناز شورو کے افسانوں میں نسائی مزاحمت کے عناصر کا مطالعہ

پیش کار: طاہرہ ناہید **رجسٹریشن نمبر:** 1735/M/U/S19

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبۂ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر بشریٰ پروین _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

پروفیسر ڈاکٹر عامر اعجاز _____

پرو وریکٹر اکیڈمکس

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں، طاہرہ ناہید حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم۔فل اسکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر بشریٰ پروین کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گی۔

طاہرہ ناہید

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

فہرست ابواب بندی

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	i
اقرار نامہ	ii
فہرستِ ابواب	iii
Abstract	vi
اظہارِ تشکر	vii
باب اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف و بنیادی مباحث	۲
الف۔ تمہید	۲
i. موضوع کا تعارف	۲
ii. بیانِ مسئلہ	۳
iii. مقاصدِ تحقیق	۳
iv. تحقیقی سوالات	۳
v. نظری دائرہ کار	۳
vi. تحقیقی طریقہ کار	۴
vii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
viii. تحدید	۵
ix. پس منظری مطالعہ	۵
x. تحقیق کی اہمیت	۵
ب۔ مزاحمت کے بنیادی مباحث	۵
i. مزاحمت	۵
ii. مزاحمت کی صورتیں و عناصر	۱۲

نسائی مزاحمت تاریخ کے آئینے میں ۱۷
اُردو ادب میں مزاحمت کی روایت ۲۱
جدید افسانے میں مزاحمت کی روایت ۲۵
ج۔ شخصیت کا تعارف ۲۷
حوالہ جات ۳۰
باب دوم: شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمت کے سماجی عناصر ۳۱
(طبقاتی نظام، معاشی نظام)
i۔ سماج ۳۲
ii۔ طبقاتی تقسیم ۳۸
iii۔ معاشی نظام ۴۲
افسانے ۴۷
i۔ کشمکش ۴۷
ii۔ صاحب جی ۴۹
iii۔ باولی ۵۰
iv۔ پناہ ۵۱
v۔ لااِکراہ فی الدین ۵۳
vi۔ آخری آدمی ۵۴
vii۔ رانی باجی ۵۶
viii۔ وقت کی امر بیل ۵۸
ix۔ مراجعت ۵۹
حوالہ جات ۶۱
باب سوم: شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمت کے ثقافتی عناصر ۶۴
(اقدار، رسم ورواج)

i۔ ثقافت ۶۴
ii۔ ثقافتی اقدار ۶۹
رسم ورواج ۷۲
افسانے ۷۵
i۔ فطرت روایت ۷۵
ii۔ پہلا کمرہ تیسری عورت ۷۶
iii۔ بازیافت ۷۸
iv۔ حویلی ۸۰
v۔ لوگ لفظ اورانا ۸۱
vi۔ منہ دکھائی بے رونمائی ۸۳
vii۔ لہروں کی دھوپ ۸۴
viii۔ وہم جو کلچر کی روایت کا حصّہ ہوتا ہے ۸۶
ix۔ وہ ۸۷
x۔ نفسیاتی عدم توازن کا کرب ۸۸
xi۔ کاروکاری ۸۹
حوالہ جات ۹۲
باب چہارم: مجموعی جائزہ ۹۵
الف۔ مجموعی جائزہ ۹۵
ب۔ تحقیقی نتائج ۱۰۸
ج۔ سفارشات ۱۰۹
کتابیات ۱۱۰

Abstract

The subject of my M.Phil dissertation is "Expressions of Resistance: Elements of Feminine Resistance in Shahnaz Shoro's Fiction".A society is a group of individuals who live on the principle that they have common interests. In common parlance, a group of all human beings is called a society. The standard and appropriate environment has some meaning in the individual life and also in the collective life of the whole society but when man does not get the standard environment he examines his surroundings and thinks about the factors. There are obstacles that stand in the way of this environment and it is this division that fosters the attitude of resistance within the conscious and sensitive human being. If one studies the history of sociology, one can see that exploitation and oppression are being tortured in various forms. Writers have played a vital role against the forces of oppression and exploitation. Shahnaz Shoro is a well known short story writer. There is resistance in their myths. His two legendary collections are "People, Word and Coming" and "Falling Sorrow "My dissertation defines resistance and discusses and describes the historical background of feminist resistance and Shahnaz Shoro's fiction describes social and elements of resistance, economic system inequality and class system and resistance of cultural elements values and customs

اظہارِ تشکر

خداوند تعالیٰ کی نعمتوں اور کرم نوازیوں کی شکر گزاری کے بعد اپنی والدہ کی مشکور ہوں جن کے تعاون اور دعاؤں کی وجہ میرا کٹھن سفر آسان ہوا اور میرا ایم فل کا مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اور اپنی استاد و نگران مقالہ محترمہ ڈاکٹر بشریٰ پروین صاحبہ کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے اس تحقیقی مقالے کی ابتدا سے لیکر تکمیل تک قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ یقینا ان کی رہنمائی کے بغیر تحقیقی کام کو مکمل کرنا مشکل تھا مگر ان کی رہنمائی نے میرا اس سفر کو آسان بنادیا۔

میں اپنے دیگر اساتذہ ڈاکٹر عابد حسین سیال، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر نازیہ یونس، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر ارشاد بیگم، ڈاکٹر رخشندہ مراد اور ڈاکٹر صنوبر الطاف کا علمی وادبی اور تحقیقی کام میں رہنمائی کرنے کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

آخر میں اپنے بھائی سید مبشر علی، سید غضنفر علی، سید اسد علی، خاوند سید رضی نقوی اور بہن فرزانہ سید کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کے تعاون کے بغیر یہ کام مکمل کرنا ناممکن تھا۔ شکریہ

طاہرہ ناہید

سکالر ایم فل اردو

باب اوّل

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

موضوع کا تعارف

سماج افراد کا ایسا گروہ جو اس اصول پر آپس میں رہائش پذیر ہوں کہ ان کے مفادات مشترک ہوں۔ عام فہم الفاظ میں تمام انسانوں کا مجموعہ سماج کہلاتا ہے۔ معیاری اور مناسب ماحول کے افراد کی انفرادی زندگی میں بھی کچھ معنی ہوتے ہیں اور پورے سماج کی اجتماعی زندگی میں بھی اپنے معنی رکھتے ہیں لیکن جب انسان کو معیاری ماحول نہیں ملتا تو وہ اپنے گردونواح کا جائزہ لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ کونسے عوامل ہیں جو اس ماحول کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں اور یہی تقسیم باشعور یا حساس انسان کے اندر مزاحمت کے رویے کو پروان چڑھاتی ہے۔ مزاحمت کے بنیادی طور پر دو پہلو ہوتے ہیں۔

۱۔ داخلی مزاحمت

۲۔ خارجی مزاحمت

اندر کی کٹھن حالات کی تبدیلی اور سماج کی بے جا پابندیوں سے انسان کے شعور میں جو خیالات جنم لیتے ہیں وہ خارجی مزاحمت کا زریعہ بنتے ہیں۔ تاریخ و سماجیات کا مطالعہ کیا جائے تو استحصال اور جبر مختلف صورتوں سے سماج میں اپنا شکنجہ جمائے ہوئے نظر آتا ہے۔ اورایسے مزاحمتی ادب بھی جنم لیتا ہے۔ ادیبوں نے جبر و استحصالی قوتوں کے خلاف بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ شہناز شورو ایک معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں مزاحمت موجود ہیں۔ شہناز شورو ۱۹۶۹ء کو میرپور خاص سندھ میں پیدا ہوئیں۔ انگریزی ادب اور اردو ادب میں ایم۔ اے کیا۔ انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری وویمن سٹڈیز میں حاصل کی۔ انھوں نے تراجم بھی کیے اور مضامین بھی لکھے۔ ان کے دوافسانوی مجموعے "لوگ لفظ اورانا" اور "زوال دکھ" شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانے مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور وہ آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں۔

۲۔ بیانِ مسئلہ

ادیب حساس طبعیت کا مالک ہوتا ہے۔ اپنے ارد گرد کے ماحول پر ادیب کی عام شخص سے زیادہ گہری نظر ہوتی ہے اور وہ سماج میں ہونے والے واقعات اور مسائل کو محسوس کرتا ہے اور قلمبند کرتا ہے۔ شہناز شورو بھی ایسی ہی ادیباہیں ان کے افسانوں میں معاشرتی مسائل سے کیسے مزاحمتی رویے جنم لیتے ہیں۔اس تحقیق میں یہ دیکھا جائے گا کہ شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمتی عناصر کس نوعیت کے ہیں اور ان کے افسانوی کرداروں نے مزاحمتی عناصر کو کیسے برتا ہے۔

۳۔ مقاصد تحقیق

۱۔ شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمتی عناصر کی پیشکش کا جائزہ لینا۔

۲۔ ان کے افسانوں میں مزاحمتی صورتوں اوران کے اثرات کو زیر بحث لینا۔

۳۔ ان کے افسانوں میں مزاحمتی رویوں کے پس منظری مسائل کا تجزیہ کرنا۔

۴۔ تحقیقی سوالات

۱۔ مزاحمت اور مزاحمت کے عناصر کیاہیں؟

۲۔ شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمت کی صورتیں کیاہیں؟

۳۔ مزاحمتی رویوں کے پس منظری مسائل کی نوعیت کیاہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار

شہناز شورو ایک معروف افسانہ نگار ہیں انھوں نے دو افسانوی مجموعے تخلیق کیے اور مضامین لکھے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا اور مرزا قلیچ بیگ کی سوانح عمری کا سندھی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمتی عناصر موجود ہیں اور مذکورہ تحقیق مزاحمتی عناصر کے تحت کی جائے گی۔ مزاحمت زندگی کی علامت ہے۔ معاشرے میں موجود مزاحمتی رویوں کو ادبا اور تخلیق کاروں نے اپنی تحریر کا حصہ بنایاہے۔ ادب میں مزاحمتی ادب کی اصطلاح فلسطینی ادیب و نقاد غسان کنفانی کے اپنے مضمون میں استعمال ہوئی۔ انھوں نے فلسطین میں مغربی استعماریت کے خلاف ایک پوری تاریخ درج ہونے کے ساتھ ہی مزاحمتی ادب کا کردار اس کے بنیادی عناصر اور وسیع تر نو آبادیاتی رجحانات، تفاوت کو زیر بحث لایا گیاہے۔

معروف نقاد میلڈ وناڈوڈینس اپنے مزاحمتی ادبی مقالے "انٹیلیکچوئلز رول ان پیرو ریکوٹوڈے" میں لکھتے ہیں کہ مزاحمتی ادب دانشوروں کا ایک مخصوص ادبی انداز ہے جس سے وہ سماجی و ثقافتی جبر کو آئسولیشن میں دیکھتے ہیں۔ نقاد ڈاکٹر قاسم یعقوب مزاحمتی رویئے میں لکھتے ہیں کہ مزاحمت طے شدہ رویوں، رسم و رواج اور رائج اقدار کے خلاف بھی ہوتی ہے۔ ابرار احمد اپنے مضمون "مزاحمتی ادب" اردو ادب احتجاج اور مزاحمت کے روئے مرتب ڈاکٹر ارتظی کریم، میں لکھتے ہیں۔ استحصال اور جبر کی بے شمار قوتیں ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر مضبوط اقوام کمزور قوموں پر اپنا شکنجہ جمائے رہتی ہیں۔ ہر سماج میں بالا دست طبقے عوام کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں، ریاست کے نام پر مذہب کے نام پر سیاست کے نام پر اور ان استحصالی قوتوں کے ہاتھ جھٹک دینے کے لئے مزاحمتی عمل بھی جاری و ساری ہے۔ ان سے تمام استفادہ کیا جائے گا۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار

اس موضوع پر تحقیق کے لیے دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا جائے گا۔ تحقیق کا موضوع شہناز شورو کے دو افسانوی مجموعے "لوگ لفظ اور انا" اور "زوال دکھ" کو بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہو گی۔ مزاحمت کے موضوع پر موجود کتابوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔ شہناز شورو کے بارے میں چھپنے والے آرٹیکل اور ناقدین کی رائے بھی میرے ماخذات میں شامل ہو گی۔ کتب کے لیے جامعاتی سرکاری اور نجی کتب خانوں کے علاوہ آن لائن مواد سے بھی حسبِ ضرورت استفادہ کیا جائے گا۔ ان کی ذاتی زندگی اور فن سے آگاہی کے لیے مصنفہ کے انٹرویو کو بھی شاملِ تحقیق کیا جائے گا۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

شہناز شورو کا شمار اردو ادب کے نمایاں لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ان کے فن و فکر اور ادبی خدمات کے حوالے سے ناقدین اظہار خیال کرتے رہتے ہیں اور ان کی افسانہ نگاری پر تبصرے ملتے ہیں، لیکن ان کے ان افسانوی مجموعوں پر ایم۔ اے، ایم۔ فل اور پی ایچ۔ڈی کی سطح پر مجوزہ تحقیقی موضوع پر پہلے کام نہیں ہوا ہے۔ شہناز شور کی ادبی خدمات پر بہاؤ الدین زکریہ یونیورسٹی ملتان میں ایم۔ فل کا تھیسز ۲۰۱۷ء میں ہو چکا ہے۔

۸۔ تحدید

مجوزہ تحقیق شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔ اس تحقیق میں ان کے دو افسانوی مجموعے "لوگ لفظ انا" اور "زوال دکھ" شامل ہیں اس کے علاوہ ان کی دیگر تحریریں، مضامین اور تراجم وغیرہ اس مقالے کی تحقیقی حدود میں شامل نہیں ہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر مزاحمت پر تحقیقی و تنقیدی کتب سے استفادہ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ وہ شہناز شورو پر لکھے گئے آرٹیکل اور تجزیئے بھی تحقیق کا حصہ ہونگے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت

شہناز شورو ایک معروف افسانہ نگار ہیں اور ان کے افسانوں میں مزاحمتی عناصر موجود ہیں۔ اس موضوع کی اہمیت فی زمانہ بہت ہے۔ ایک عام انسان ظلم کے خلاف مزاحمت کو نہیں پہچانتا اور یہاں تک کہ اگر وہ مزاحمت کر بھی رہا ہوتا ہے تو اسے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کس درجے کی مزاحمت ہے اس لیے ان پہلوؤں کو جاننا بہت ضروری ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمتی عناصر موجود ہیں۔ ان کی شناخت ہو اور یہ تلاش کروں کہ مزاحمت سود مند تھی یا نہیں اور مزاحمت کے کیا اثرات ہوئے اور نو عیت کیا تھی اور قاری کے لیے ان کی تحریروں کی تقسیم میں رہنمائی ملے۔

ب۔ مزاحمت کے بنیادی مباحث

مزاحمت

> "مزاحمت ہر ایسے عمل، سوچ، رویے یا طرق کار کو کہا جات جو کسی نا انصافی، ظلم تشدد، بربریت یا جبر کے خلاف ہو۔"(۱)

مزاحمت کی اصطلاح مغرب سے آئی ہے۔ انگریزی میں مزاحمت کے لیے Resistance کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی مقابلہ، روک ٹوک اور مدافعت و مزاحمت کے ہیں۔ مزاحمت کا لفظ عربی لفظ مذاہم سے ہے اور اس کے معنی، روک، رکاوٹ، حائل اور مزاحمت کرنے والے ہیں۔ مزاحمت ایسے عمل کا نام ہے جو پہلے سے موجود کسی نظام تحریک کے خلاف ہو۔ میرے مزاحمت رد عمل ہے کسی عمل کا۔ گویا

مزاحمت ایسے عمل کا نام ہے جو کسی پہلے سے موجود کسی نظام یا تحریک خلاف ہو تو مزاحمت رد عمل کے طور پر سامنے آتی ہے۔ مزاحمت دفاعی عمل ہے اپنی جان ومال و نظریات کا دفاع بھی مزاحمت ہے اور انسان میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی خواہش کا اظہار ہے۔ انسان فطری طور پر اپنی زندگی میں مداخلت کو پسند نہیں کرنا چاہیے یہ مداخلت مزاحمت سے زندگی میں حرکت ہے۔ مزاحمت نہ ہو تو ان کی زندگی میں جمود آجائے مزاحمت زندگی کی علامت ہے اور ایک زندہ انسان میں اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی خواہش ہوتی ہے اور اس میں احساس ملکیت ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ اپنی آزادی میں دخل برداشت نہیں کرتا اور یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی آزادی کو چھینے۔ مزاحمت کا لفظ نیا ہے لیکن اس کا عمل قدیم ہے۔ جیسے ہی انسان اس کرہ عرض پر آنکھ کھولی تب ہی اپنی بقا کی کوششوں میں مصروف ہو گیا اس کو جینے کے لیے بہت دشوار گزار حالات، جیسے آسمانی آفات، موسمی تبدیلیاں، یا جنگلی حیات سب سے نبرد آزما ہونا پڑا اور اپنے لئے جینے کی راستے ڈھونڈ لیئے۔

"Concise oxford American Dictionary:

The refusal to accept or company with something

the attempt to prevent something by action or argument" (۲).

انسان کو اپنے لیے ساز گار ماحول آرام دہ زندگی کے لئے بہت سے دشوار راستے عبور کرنے پڑے جن میں ایک جبر بھی ہے جبر کی بہت سی صورتیں ہیں یہ بہت ساری صورتوں میں سامنے آتا گیا۔

۱۔ جیسے ایک صورت ہے کہ جب کوئی بیرونی طاقت حملہ آور ہو یہ حملہ گھر کی چار دیواری یا وطن پر بھی ہو سکتا ہے اور اس حملے کی صورت میں جان ومال کے خطرے کے علاوہ سماجی، معاشی اور معاشرتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

۲۔ جبر کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس میں قوم رہائشی جبر کا شکار ہو جاتی ہے۔ جسے بادشاہی دور میں ہر علاقہ جبر کا شکار رہا اس دور میں عوام اور غلام کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ فرد اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ سیاسی و معاشی آزادی بھی چھین جاتی ہے اور ان تمام باتوں کا اثر انسانی فکر اور نفسیات پر ہوتا ہے۔

۳۔ جبر کی تیسری صورت میں سماج اندرونی طور پر ایسی حالات کا شکار ہو جاتا ہے جس سے سماجی و سیاسی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ عموماً اس صورتحال کے پیچھے بھی خارجی طاقت کار فرما ہوتی ہے۔

انسان فطری طور پر اپنے ماحول کا عادی ہو جاتا ہے اور جیسے ہی اس کی زندگی میں کوئی تبدیلیاں رکاوٹ ہے تو وہ بے چینی کا سبب بنتی ہے اور اس تبدیلی کے خلاف مزاحمت ہوتی ہے۔ مزاحمت کا عمل دفاعی عمل ہے اور مزاحمت اس وقت سامنے آتی ہے جب داخل اور خارج سے کوئی کسی فرد پر یا معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ سماج میں تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے گو کہ یہ تبدیلیاں سست روی سے ہوتی ہیں اور محسوس بھی نہیں ہوتیں کبھی معاشرہ ان کو قبول کر لیتا ہے اور کبھی رد کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر طارق علیم اپنی کتاب "اردو کی ظریفانہ شاعری" میں لکھتے ہیں:

> "مزاحمت انسان کی اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی شدید خواہش کا اظہار یہ ہے وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتا اسے یہ قبول نہیں کہ اس لائق دوسرا لے جائے۔ مزاحمت زندگی کی علامت ہے۔"(۳)

انسان میں ملکیت کا جذبہ موجود ہوتا ہے اور وہ اسی وجہ سے اپنے ماحول اور اشیاء سے بہت پیار کرتا ہے اور ان کے چھین جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اور وہ اشیاء کے ساتھ ساتھ اپنے نظریات وعقائد سے بھی پیار کرتا ہے اور ان نظریات وعقائد میں تبدیلی برداشت نہیں کرتا اور مزاحمت کرتا ہے۔

ڈاکٹر طارق علیم اپنی کتاب میں اس بارے میں لکھتے ہیں:

> "زندہ انسان اپنی مرضی سے جینے کی خواہش رکھتے ہیں، وجودی فلسفے کے پیروکار تو مزاحمت کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ جو مزاحمت نہ کرے اسے انسان ہی تسلیم نہیں کرتے۔"(۴)

مزاحمت کی بہت سی صورتیں اور مختلف انداز ہیں۔ مزاحمت انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی جاتی ہے۔

انفرادی مزاحمت

فرد جب کسی بات، عمل یا تحریک کو اپنے خلاف سمجھے اور اس کو نہ ماننا چاہے تو مزاحمت کا آغاز ہوتا ہے اور مزاحمت شروع ہی انفرادی حیثیت میں ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان پیدائشی طور پر آزاد رہنا پسند کرتا ہے اور اپنی آزادی میں جب بھی کوئی خلل محسوس کرتا ہے تو مزاحمت جنم لیتی ہے۔ انسان اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزرنا چاہتا ہے لیکن یہ ایک خواب ہے جب فرد پر زندگی کی حقیقتیں کھلتی ہیں اور اپنے ارد گرد کے لوگوں کو

مشکلات اور دکھ درد میں مبتلا دیکھتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے اور ان حالات میں ان کے لیے کچھ کرنے کے جذبات ابھرتے ہیں اور یہ ہی جذبات مزاحمت کو جنم دیتے ہیں۔

روبینہ سہگل اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

"اجتماعی مزاحمت بھی انفرادی سے شروع ہوتی ہے جب تک کوئی فرد اپنے اندر کسی عمل کے خلاف غم وغصے اور نفرت کے جذبات نہ محسوس کرے تب تک وہ اجتماعی نہیں ہو سکتی۔"(۵)

جب کوئی معاشرہ استحصال کا نشانہ بنتا ہے تو اپنے طور پر مزاحمت کرتا ہے۔ جس میں جو صلاحیت ہوتی ہے وہ اس کو استعمال کرتے ہوئے اس کا اظہار کرتا ہے۔ سپاہی، استاد، شاعر ہو یا ادیب سب اپنے اپنے طور پر مزاحمت کرتے ہیں۔ شاعر تلوار لے کر جنگ نہیں کرتا لیکن اس کا ہتھیار اس کا قلم اور زبان ہے اور شاعر اپنے اشعار کے ذریعے مزاحمت کرتا ہے اور ادب میں مزاحمت کے لیے مزاحیہ رویے کو بھی اہمیت حاصل ہے اور مزاحمت کا ایک طریقہ ظالمانہ اور ناپسندیدہ تبدیلیوں کا مذاق اڑانا بھی ہے۔

"ہر انسان پیدائشی طور پر اپنے اندر مزاحمت اور جارحیت کا جذبہ لے کر اس دنیا میں آتا ہے۔"(۶)

اجتماعی مزاحمت

مزاحمت انفرادی سے شروع ہو کر اجتماعی صورت اختیار کر لیتی ہے مزاحمت کی اس صورت میں سب افراد مل کر مزاحمت کرتے ہیں۔ ان افراد کے مفادات مشترکہ ہوتے ہیں اور یہ کسی بھی ظلم و زیادتی کا شکار ہو رہے ہوتے ہیں۔ اگر افراد کا آپس میں اتحاد ہو زیادتی و ناانصافی کو مشترکہ طور پر محسوس کریں تو اجتماعی مزاحمت شروع ہوتی ہیں۔ اجتماعی مزاحمت میں افراد کا کردار بہت اہم ہوتا ہے کسی ایک فرد کو رہنما یا لیڈر کے طور پر قبول کیا جاتا ہے اجتماعی مزاحمت کو تحریک بھی کہا جا سکتا ہے۔ اجتماعی مزاحمت میں مطالبات، اغراض و مقاصد واضع ہوتے ہیں۔

تاریخ کے مطالعے سے ہمیں اجتماعی مزاحمت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں:

انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء بھی اجتماعی مزاحمت کی بدولت ہی کی وجہ سے ہوا۔ اس تحریک میں لوگ واضع طور پر اپنے دشمن کو پہچانتے تھے۔ غریب عوام بھوک سے مر رہی تھی بادشاہ کے دربار میں امرا محفلیں

سجاتے تھے تمام وسائل پر بادشاہ امرا اور مذہبی رہنماؤں کا قبضہ تھا۔ اس انقلاب کے رہنماؤں میں دالستن، روسپر شامل تھے۔ فرانسیسی لوگ آزادی کا نعرہ لگا رہے تھے اور ان کے مطالبات برابری، بھائی چارہ، آزادی اور ان پر عائد ٹیکسوں کو ختم کرنا شامل تھا۔ اجتماعی مزاحمت کی ایک اور مثال انقلاب روس ۱۹۱۷ء ہے۔ اس انقلاب سے پہلے روس میں بادشاہت تھی۔ یہ ایک زرعی ملک تھا۔ عوام غربت اور پسماندگی کا شکار تھی۔ رہنماؤں میں لیتن پر کال مارکس کے نظریات کا اثر کافی گہرا تھا۔

روبینہ سہگل اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

> "کارل مارکس نے معاشرے میں طبقوں کی تقسیم کی نشاندہی کی اور معاشرے کی غیر منصفانہ تقسیم کی مذمت کی۔"(۷)

۱۹۱۷ء لیتن کی کوشش کامیاب ہوئیں اور روس کو سوشلسٹ ملک کا درجہ حاصل ہوا۔ مزاحمت ہی سے زندگی میں تبدیلی آتی ہے اگر یہ مزاحمت نہ ہو تو زندگی جمود کا شکار ہو جائے۔ تاریخ کے مطالعے سے واضع ہو جاتی ہے کہ وہ معاشرے جو وقت کے ساتھ اپنے اقدام اور روایات میں تبدیلی نہیں لائے وہ مٹ گئے۔ جب بھی کوئی شخص معاشرے میں کسی بات یا واقعے پر رد عمل دیتے ہے یا ماننے سے انکار کرتا ہے تو اسے مزاحم قرار دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ مزاحم ہی تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔ یہ مزاحم ہر دور میں ہوتے ہیں اپنے خلاف ہونے والی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔

نفسیاتی مفکر سیگمنڈ فرائڈ کہتے ہیں:

> "انسان چونکہ جانوروں کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے جانور میں دو خصوصیات ہوتی ہیں جو اس کے زندہ رہنے اور اس کی افزائش کے لیے ناگزیر ہے پہلے اس خصوصیت میں جارحیت کا جذبہ، دوسری خصوصیت جو جاندار چیزوں اور انسان میں یکساں ہیں وہ ہے جنس کی افزائش یہ دونوں احساسات بنیادی طور پر دفاعی ہے اور خود کو قائم رکھنے کے لیے فطرت نے جانداروں میں ڈالے ہیں۔"(۸)

کوئی بھی معاشرہ ہو اگر اس کے مذاہب معاشی نظام اور سیاسی نظام میں عدم مطابقت ہو تو مزاحمت کا آغاز ہونا لازمی ہے ایک انسان اپنے ارد گرد کے ماحول اور مسائل سے کنارہ نہیں کر سکتا وہ اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کے جذبے کے تحت مزاحمت کرتا ہے. ہر معاشرے میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو اپنے سے کم

اور پست کا استحصال کرتا ہے اور اس استحصال کی بہت سی صورتیں ہوتی ہیں جن کا افراد شکار ہوتے ہیں کبھی یہ استحصال معاشی طور پر کیا جاتا ہے۔ مزاحمت کو زیادہ تر نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ترقی پذیر اور مابعد نو آبادیاتی ممالک میں سماجی اقدار کمزور ہو جاتی ہیں۔ لوگ مختلف گروہوں اور طبقات میں بٹ جاتے ہیں اور ایسے ماحول میں مزاحمت فروغ پاتی ہے۔

David Jefferes
The idea of resistance provide a primary framework for the critical project of postcolonialism resistance is continual referent and at least implicit locus of much post-colonial criticism and theory, particularly in terms of the analysis of the failure or deferral liberation.(9)

مزاحمت انسان کے اندر کی آواز ہے۔ ہر انسان جو باشعور ہے وہ اپنے یا اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی وزیادتی کو محسوس کرتا ہے لیکن اپنے محسوسات کا اظہار نہیں کر پاتا لیکن ایک ادیب اپنے احساسات کو کاغذ پر منتقل کرتا ہے۔ یہ الفاظ اس کے خیالات کا عکس ہوتے ہیں۔

ابرار احمد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"ادب تخلیق کرنا بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیونکہ ادیب اپنے گرد و پیش سے Conform نہیں ہوتا پاتا اور اس کشمکش کی بنیاد پر ادب تخلیق کرتا ہے۔ ایک طرح سے تو سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی ہے۔"(۱۰)

مزاحمت ایک ابتدائی سوچ کا نام ہے اور یہ گھٹن زدہ ماحول کی پیداوار ہے۔ ہمیں معاشرے میں مزاحمت کی مختلف صورتوں میں نظر آتی ہے کہیں یہ طبقاتی تقسیم کی صورت میں دکھائی دیتی ہے جب معاشرہ طبقات میں بٹ جاتا ہے اور یہ طبقات کبھی زر اور زمین کے لیے دوسروں کا استحصال کرتے ہیں اور جن کا استحصال ہو رہا ہوتا ہے وہ استحصال کرنے والوں کے خلاف اور اپنے حقوق کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہندو معاشرہ میں بہت سے طبقات میں نظر آتے ہیں اس معاشرے میں برہمن کھتری۔ ولیش۔ شودا جیسے طبقات موجود ہوں کچھ معاشروں میں امیر اور غریب کی تقسیم ہے اور ان طبقاتی تقسیم کی وجہ سے مزاحمت کا آغاز ہوتا ہے اور سماج میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے کمتر طبقہ کی مزاحمت شروع ہوتی ہے۔ اور اسی سماج میں جب استحصالی طاقت کے خلاف مزدور طبقہ آواز اٹھاتا ہے تو ایسی مزاحمت کو سماجی مزاحمت کہا جاتا ہے۔ کسی بھی معاشرے یا ملک میں غیر جمہوری رویوں کی وجہ سے مزاحمت کی فضا قائم ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے

بعد پاکستان میں مختلف ادوار میں مارشل لاء لگا اور آمرانہ رویوں کے خلاف جو مزاحمت ہوئی وہ سیاسی مزاحمت کی مثالیں ہیں۔ معاشرے میں روایات کے خلاف بھی مزاحمت کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں اور یہ سماجی مزاحمت کی مثال ہیں۔

ہم ادب کا مطالعہ کرنے سے بھی بہت سی مزاحمت دیکھتے ہیں اب میں زبردستی نہیں ہے اور نہ ہی ادیب پر کوئی نظریہ یا فکر زبردستی لاگو نہیں کیا جا سکتا اور ادب میں ادبی روایات کی بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جیسے اردو شاعری میں جو ایک مقبول صنف ہے اس میں قافیے اور ردیف کے خلاف مزاحمت سے پابند نظم کا آغاز ہوا۔ پھر پابند نظم کے خلاف مزاحمت سے آزاد نظم تخلیق ہوئی۔ بدلتے وقت کے ساتھ مزاحمت کا انداز بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔ انسان آغاز سے ہی بہت سارے مسائل سے دوچار رہا جیسے نسلی تضاد، مذہبی استحصال، نوآبادیاتی تسلط، طبقاتی و معاشی نظام کی ناہمواری اور سیاسی جبر اور ان مسائل کی وجہ سے مزاحمتی رویے بھی سامنے آتے رہے ہیں مزاحمت کے عام طور پر دو پہلو نمایاں ہوتے ہیں ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔

داخلی مزاحمت

اس مزاحمت کا انسان کے ذہن اور سوچ سے تعلق ہوتا ہے اور یہ انسان سوچ معاشرے میں بدلتے ہوئے حالات کی پیداوار ہوتی ہیں۔ معاشرہ انسانوں سے تشکیل پاتا ہے اس لئے معاشرے میں ہونے والی تبدیلیاں افراد پر اثر انداز ہوتی ہیں اور یہی تبدیلیاں انسانوں رویوں کو بھی تبدیل کرتی ہیں اور یہ رویے معاشرے کے ماحول پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں اور جب فرد اور ماحول میں مطابقت نہ ہو اور حالات بھی ناسازگار ہوں تو یہ تمام باتیں فرد میں ذہنی کشمکش پیدا کرتی ہیں جن کی وجہ سے فرد میں عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ خوف فرد میں مزاحمتی رویے کو جنم دیتا ہے اور فرد اس ماحول نبرد آزما ہونے کی تدبیریں سوچتا ہے جب اس اظہار کا راستہ نہیں ملتا تو خود کلامی کا راستہ چنتا ہے اور یہ خود کلامی اس کے اندر کی آواز ہوتی ہے۔ اور داخلی مزاحمت ہی خارجی مزاحمت کا باعث ہوتی ہے۔ ہمیں ایسے افراد دیکھنے کو ملتے ہیں جو خود کلامی میں مصروف ہوتے ہیں وہ اپنے مسائل اور حالات سے جنگ کر رہے ہوتے ہیں اور اعصابی تناؤ خود کلامی کا باعث بنتا ہے ماہرین نفسیات کہتے ہیں۔

> "اپنے آپ سے بات کرنا بالکل نارمل اور عام سی بات ہے ایسے لوگوں کا دماغ درست ہوتا ہے اور خود کلامی انسانوں کے لیے صحت مند ہے۔"(۱۱)

خارجی مزاحمت

اندر کی گھٹن، اضطراب ہی خارجی مزاحمت کا سبب بنتے ہیں۔ خارجی مزاحمت عملی مزاحمت کا نام ہے۔ انسان جب داخلی مزاحمت سے سکون نہیں پاتا تو اپنی تسکین کے لیے عملی مزاحمت کی جانب آتا ہے۔ خارجی مزاحمت کی کئی صورتیں ہیں جیسے کوئی فرد ایک کام جان بوجھ کر لگاتار کرنے لگے یا کوئی شخص مکمل خاموش ہو جائے یا مار پیٹ، چیخ و پکار یا پھر تقریر کا سہارا لے جب وہ یہ عمل دہراتا ہے تو اپنا کتھارسز چاہتا ہے۔

> "انسانی جذبات پر بند باھنے والی شے ہماری عقل ہے اور ہماری زبان سے نکلی تحریر یا آنکھوں سے بہتے آنسو وہ ذریعہ ہیں جو جذبات کے تند دریا کے بہاؤ کا زور کم کرتے ہیں تاکہ وہ ہماری عقل کے بنائے ہوئے بن کے قابو میں رہے۔"(۱۲)

شروع میں یہ کتھارسز تقریر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اندر کی بے چینی گھٹن اور اندرونی کیفیت اس سے اپنے خیالات کا اظہار کراتی ہے۔

اوڈ کلس نے کہا:

> "بے شک ایک تقریر سے خطرناک نتائج بھی بر آمد ہوسکتے ہیں اور یہ لوگوں کو تشدد پر بھی ابھار سکتی ہے۔ لیکن تاریخ اس امر کی شاھد ہے کہ خیالات کو دبائے رکھنا اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔"(۱۳)

خیالات کا اظہار انسانی فطرت ہے چاہے فرد کے حالات ہوں یا اس کے اپنے یا ارد گرد کے لوگوں کے رویے وہ خاموش تماشائی نہیں بن سکتا اور اظہار کا سہارا لیتا ہے یہ اظہار منفی بھی ہو سکتا ہے اور مثبت بھی یعنی تعمیری بھی ہو سکتا ہے اور تخریبی بھی۔ یہ سب حالات اور انسانی خیالات کی وجہ سے ہوتا ہے۔

مزاحمت کی صورتیں و عناصر

مزاحمت ایک شعوری احساس ہے جب ہمیں اپنے مسائل سے آگہی ہو جائے جب ہمیں اپنے مسائل سے آشنا ہو جائیں تب مزاحمت ہوتی ہے۔ مزاحمت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مزاحمت میں مسائل کا

شعور ہو اور عقل و دانش مندی جذبات پر حاوی رہے اور جلد بازی سے اجتناب کیا جائے کیونکہ مزاحمت بمقابلہ مزاحمت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عمران کہتے ہیں محروم اپنے حق کے چھن جانے پر مزاحمت کرتا ہے اور غاصب اپنی طاقت اور قبضہ کے چھن جانے کی کوشش کے خلاف مزاحمت کرتا ہے۔ مزاحمتی ادب سے مراد کسی فکر نظام یا نظریے سے انکار ہے کسی فرد کا اپنے خوابوں خیالوں اور خواہشات کی تکمیل میں رکاوٹ مزاحمت کو جنم دیتی ہے۔ مزاحمت طے شدہ رویوں، رسم ورواج، رائج اقدار اور ظلم و جبر کے خلاف سامنے آتی ہے۔ مزاحمت ہر دور میں رائج رہی کہیں پوشیدہ کہیں ظاہر۔ مزاحمت دفاعی عمل ہے یعنی کوئی عمل ہو گا تو ردعمل کی صورت میں سامنے آئے گا۔یعنی کسی فرد کی مزاحمتی قوت اس وقت سامنے آئے گی جب کوئی اس پر حملہ کرے گا۔اسی طرح کسی بھی معاشرے میں ہمیں مزاحمت اس وقت نظر آتی ہے جب کوئی بھی طاقت اس کے مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کو بدلنے یا درہم برہم کرنے کی کوشش کرے۔

مزاحمت کے معاشرے میں بہت سی صورتیں دکھائی دیتی ہے۔

i. مذہبی
ii. سیاسی
iii. سماجی
iv. ثقافتی
v. معاشی

مزاحمت زندگی کی علامت ہے انسان میں سب سے شدید خواہش اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی ہے اور وہ اپنی آزادی میں مداخلت برداشت نہیں کرتا مزاحمت تب شروع ہوتی ہے جب انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر خود پر کوئی جبر محسوس کرتا ہے یہ جبر دو طرح سے محسوس کرتا ہے۔

ا۔نفسیاتی جبر
۲۔حیاتیاتی جبر

نفسیاتی جبر

نفسیاتی جبر میں انسان خود کو کمتر لوگوں کے تابع محسوس کرتا ہے۔یعنی جب اس کو اپنی عقل و دانش کے مقابلے میں کمتر جگہ قائم رہ کرنا پڑے تو اسکے اندر مزاحمت پیدا ہوتی ہے اس قسم کی ایک مثال سقراط ہے، سقراط فکر و دانش کے جس مقام پر تھا اس نے کم تر لوگوں کی اطاعت سے انکار کر دیا۔

حیاتیاتی جبر

یہ جبر انسان تب محسوس کرتا ہے جب اس کے جسمانی وجود کے تسکین کے لیے ضروری اسباب نہ کیے جا رہے ہوں۔ اس صورت میں انسان بغاوت کا راستہ اختیار کرتا ہے اور بغاوت مزاحمت ہی کی ایک صورت ہے اور بغاوت انسان کو منفی طریقوں کی طرف بھی لے جا سکتی ہے بغاوت تخریب تب بنتی ہے جب اس کے پیچھے جذبات اور ہیجان کی قوتیں کار فرما ہوں۔ انسان کی ہیجان کی کیفیت جو کہ عارضی نوعیت کی ہوتی ہے اس سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے اکثر کو گوں کی اس ہیجان کیفیت حیاتیاتی ضرورتBiologicalسے محرومی ہوا کرتی ہے اور اگر بغاوت میں عقل و شعور سے کام لیا جائے تو انسان کسی بھی تخریبی راستے سے اجتناب کرتا ہے اور ایسے لوگ اپنے عمل کے منفی اور مثبت نتائج سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اجتماعی مزاحمت میں ایک علاقے یا گروہ کے افراد کسی نظام یا ادارے کی وجہ سے خود دباؤ محسوس کریں اور ان کے مفادات مشترک ہوں تو مزاحمت و احتجاج کا راستہ اپناتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عمران بخاری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> "اجتماعی سطح پر مزاحمت تب جنم لیتی ہے جب انسانوں کی عظیم اکثریت خود کو معاشرتی، معاشی یا سیاسی دائروں میں آزاد ارادے اور بنیادی ضروریات زندگی سے محروم محسوس کرنے لگیں۔"(۱۴)

معاشی

انسان کی سب سے بنیادی اور اہم ضرورت معاشی ہے یعنی انسان کی زندگی میں روزمرہ کی ضروریات پر پہنچ آسانی سے ہو۔یعنی اس کے گھر اور خاندان کو یہ ضروریات میسر ہوں۔ بچہ جب بھی دنیا میں آتا ہے دودھ کے لیے روتا ہے اور مزاحمت کرتا ہے کسی بھی معاشرے کے لئے فرد کی بنیادی ضروریات کا حصول اور

معاشرتی عدل بہت ضروری ہے اگر معاشرے میں عدل و انصاف اور معاشی طور پر استحکام نہیں ہو گا تو احتجاج و مزاحمت یقینی ہے۔

ڈاکٹر عمران اپنے مضمون میں حضرت علی ؓ کا قول لکھتے ہیں:

"حضرت علیؓ کے بقول کوئی بھی معاشرہ کفر پر قائم رہ سکتا ہے ظلم پر قائم نہیں رہ سکتا۔"(۱۵)

جب معاشرہ طبقات میں بٹا ہو طبقے کے لیے سماجی اور قانون مراعات ایک طبقے کے لیے علیحدہ اور دوسرے طبقے کے لیے الگ ہوں اور معاشرے کے زیادہ تر لوگ معاشی استحصال کا شکار ہو کر جانوروں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں تو احتجاج مزاحمت اور بغاوت ناگزیر ہو جاتی ہے اور جب معاشرے کے افراد خط غربت سے بھی نیچے کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں تو اصلاح کا کام اور مذہبی طریقہ کار بھی موثر نہیں رہتا یعنی ایسی صورتحال کے بارے میں حدیث شریف میں ہے۔

"فقر کفر تک پہنچا دیتا ہے۔"(۱۶)

جب معاشرے کے افراد محسوس کرنے لگیں کہ اپنے حکمرانوں نے جینے کا اختیار ان سے چھین لیا ہے یا اس بات کا احساس ہو جائے کہ ان کے اس اختیار پر کوئی قوت اثرانداز ہونے کی کوشش کر رہی ہے تو مزاحمت کے حالات پیدا ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی میں دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا بھر میں نو آبادیاتی نظام نے دم توڑنا شروع کیا اور یورپی اقوام کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اب سے جہاں استعماریت کی لوٹ مار کے سیاسی، سماجی اور معاشی بد حالی اپنے عروج پر تھی ان کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام اور ۱۹۴۷ء میں اسرائیل کا قیام ہوا برصغیر میں دو ممالک تقسیم سے پہلے سلطنت برطانیہ کے زیر اثر تھے آزادی کے بعد پاکستان گوناگوں مسائل کا شکار رہا ان مسائل میں لیڈر شب، سماجی، ثقافتی اور معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ سرحدوں کی غیر متعینہ صورتحال بھی شامل تھی اور ان حالات میں مزاحمت کی فضا پیدا ہوئی۔ مثال کے طور پر جو لوگ پاکستان میں آئے وہ ایک نئی منزل کے خواب سجا کر آئے۔ لیکن شروع حالات ایسے نہیں تھے جیسا کہ وہ سوچ کر آئے تھے اور انہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ زندگی گزارنے اور نئے پاکستان کے قیام میں بہت جدوجہد کرنا پڑا لیکن ملک میں بڑھتے ہوئے مسائل نے مزاحمت کی فضا قائم کی جو اب تک جاری ہے۔

"مزاحمت درحقیقت ان آزاد سماجی وثقافتی رویوں کے جبری استحصال
سے انکار کانام ہے جو سیاسی وعمرانی دباو کے تحت انسانی زندگی میں
درآتا ہے۔"(۱۷)

دوسری جانب اسرائیل کے بعد فلسطین تقسیم ہو گیااور اپنے ایک اکثریتی حصّے سے محروم ہو گیا۔اس جغرافیائی تقسیم کے علاوہ مذہبی اور مقدس مقامات اور بیت المقدس کی بھی تقسیم اور اسرائیل کی انانیت ان سب واقعات نے مزاحمت کی تحریک کو جنم دیا۔ادب سب سے پہلے مزاحمت کی اصطلاح کو ایک فلسطینی ادیب عنان کنفانی نے اپنے مضمون "فلسطین میں مزاحمتی ادب" میں استعمال کی اور اس مضمون میں مزاحمتی ادب اور اس کے عناصر کو بیان کیا۔لیکن بعض ماہرین کا یہ ماننا ہے کہ سب سے پہلے مزاحمت کی اصطلاح "Barbra Harlow" باربراہارلو نے متعارف کرایا۔مزاحمت کی اصطلاح بھلے کسی نے بھی کی ہو لیکن مزاحمتی ادب کی اصطلاح آمریت کے دور میں متعارف ہوئی۔

معروف نقاد میلڈ وناڑوڈینس نے اپنے مضمون انٹیکچو ئلز رول ان پیرور یکور ٹوڈے میں لکھا:

"مزاحمتی ادب دانشوروں کا ایک مخصوص ادبی انداز ہے۔جس سے سماجی
وثقافتی جبر کو آئسو لیشن میں دیکھتے ہیں۔"(۱۸)

مزاحمت وہ شعوری احساس ہے جب ہمیں اپنے مسائل سے آگہی ہو جائے ہمیں اس کی مثال نظر آتی ہے جہاں عوام کو جب یہ احساس ہوا کہ یہ گروہ ان کے حقوق حکمرانی پر ڈاکہ ڈال رہا ہے تو انہوں نے ایک فوجی گروہ کے خلاف مزاحمت کی اور دنیا کو حیران کر دیا۔مزاحمت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مزاحمت میں مسائل کا شعور ہو اور عقل ودانش مندی جذبات پر حاوی رہے اور جلد بازی سے اجتناب کیا جائے کیونکہ مزاحمت بمقابلہ مزاحمت ہی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عمران بخاری اپنے مضمون مزاحمت میں لکھتے ہیں:

"محروم اپنے حق کے چھن جانے پر مزاحمت کرتا ہے اور غاصب اپنی
طاقت اور قبضہ کے چھن جانے کی کوشش کے خلاف مزاحمت
کرتا ہے۔"(۱۹)

مزاحمت کا پھل دنوں میں نہیں ملتا بلکہ اس کے لیے سالوں نہیں صدیاں درکار ہوتی ہیں۔

مزاحمت اور رد عمل

مزاحمت بنیادی طور پر عربی زبان کا لفظ ہے جس کی اصل مزاحم ہے۔ مزاحم کے لفظی معنی روک ٹوک، خلل ڈالنا، رخنہ اندازی کرنا، ٹکڑانا، مدافعت اور راہ کا مسدود کر دینا اور رکاوٹ کے ہیں۔

مزاحمت ایسے عمل کا نام ہے جو پہلے سے موجود کسی نظام یا تحریک کے خلاف ہو گویا مزاحمت رد عمل ہے کسی عمل یا واقعہ کا۔ مزاحمت ایسے عمل کا نام ہے جو پہلے سے موجود کسی نظام اور تحریک کے خلاف ہو تو رد عمل کے طور پر سامنے آتی ہے۔ مزاحمت دفاعی عمل بھی ہے یعنی اپنی جان و مال و نظریات کا دفاع بھی مزاحمت ہے۔

نسائی مزاحمت تاریخ کے آئینے میں

جب سے اس دنیا کا وجود ہوا ہے ہمیں عورت حالات کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے عورت نے انسان کی پیدا کردہ مصیبتوں اور قدرتی آفات یعنی قسم کے حالات میں مقابلہ کیا۔ خواتین نے مختلف ادوار میں مختلف امور پر تحریکیں بھی چلائیں شہری حقوق کی بات ہو یا ماحول کے تحفظ کی ہم نے عورت کو زندگی کے ہر مسائل پر آواز اٹھاتے دیکھا اور اس نے انفرادی دونوں قسم کی مزاحمت اختیار کئیں۔ آل انڈیا ویمن کانفرنس نے ۱۹۶۷ء میں کم عمری کی شادی پر پابندی کا مطالبہ کیا اور ۱۹۳۰ء میں یہ مطالبہ قانون ساز اسمبلی میں پیش کیا اور خواتین پنڈت من موہن اور وائسرائے قائداعظم سے ملاقات کی اور پھر اس مطالبے کو مدارس اسمبلی سے منظور کرایا۔ اس کے بعد ہندو اور مسلم عورتوں کی بہتری کا مطالبہ ویمن کانفرنس نے ۱۹۳۴ء میں اٹھایا. اس کا نتیجے میں ریاست نے مردوں اور عورتوں کا طلاق کے معاملے پر یکساں حقوق دیئے اور اس کے بعد ۱۹۲۹ء ہندوستان کی خواتین تنظیموں نے جائیداد اور وراثت کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی اور ہندو کوڈ کے ظالمانہ قوانین کو ختم کرنے کے لیے آواز اٹھائی ان کی کوششوں کے نتیجہ میں قانون ساز اسمبلی میں ایک عورت کی نمائندگی کو منظور کیا۔ اس کے علاوہ خواتین کانفرنس نے عورتوں کو عصمت فروشی کی تباہی پر اخلاقی و سماجی اصولوں پر آواز اٹھائی۔ اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آتے ہی آل انڈیا ومن کانفرنس نے اس کی رکنیت اختیار کیا اور سماجی اور معاشرتی کونسل میں مشاورتی رکن بن گئیں۔ خواتین تنظیموں نے نسلی امتیاز کی ذات، پات اور رنگ و نسل کے امتیازات پر بھرپور آواز اٹھائی۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی خواتین باشعور اور متحرک تھیں ان میں قوت ارادہ اور عدم حوصلہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر قومی آزادی

کی تحریکیں شروع ہوئیں اور حق خودارادئیت کی تحریکوں میں خواتین نے بھرپور حصہ لیا۔ پاکستان کی تحریک آزادی میں خواتین کا اہم رول رہا ان میں بیگم نسیم جہاں، بیگم شاہ نواز اور بیگم سلمٰی تصدق حسین کے کردار نمایاں رہے۔ ان خواتین نے حکومتی اقدامات کی پرزور مذمت کی اور ایک جلسے جلوسوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ لڑکی صغریٰ بی بی نے سیکریٹریٹ کی عمارت پر مسلم لیگ کا پرچم لہرایا یہ ایک اہم کارنامہ تھا۔ الجزائر کی قومی آزادی کی تحریک جو کہ فرانس کے خلاف تھی اس میں بھی خواتین نے بھرپور کردار نبھایا اس کے علاوہ امریکہ اور برطانیہ کی جنگ آزادی میں عورتوں نے مردوں کے ساتھ بھرپور ساتھ نبھایا۔ فلسطینی خواتین نے بھی اسرائیل کے ظلم و تشدد کے خلاف کارہائے نمایاں انجام دیتے۔ کشمیر کی آزادی کے لئے بھی کشمیری خواتین کا برسرپیکار ہیں ان کی قربانیاں ایک دن ضرور رنگ لائیں گی اور کشمیر کو آزاد کرائیں گی۔ یہ تمام عوامل اور تحریکیں عورتوں میں خوداعتمادی پیدا کرتی ہیں اور شعور آگہی پار کر وہ اپنے حقوق جو پہنچادیتی اور دنیا سے منواتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد بھی آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن (APWA) کی مسلسل جدوجہد کی وجہ سے ۱۹۴۱ء میں عائلی قوانین کو منظور کرلیا۔ اجتماعی مزاحمت کے ساتھ ساتھ خواتین کی انفرادی مزاحمت کی مثالیں بھی موجود ہیں۔

انفرادی مزاحمت

اجتماعی مزاحمت کے ساتھ اکیلی عورت کی جرات و بہادری کے واقعات بھی تاریخ میں موجود ہیں۔ خواتین نے ادب اور فنون لطیفہ میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے جبکہ خواتین کا پڑھنا لکھنا، رقص موسیقی میں حصہ لینا معیوب سمجھا جاتا خواتین کے اس کام کو مزاحمت کہا جا سکتا ہے اور یہی مزاحمت رنگ لائی اور خواتین زندگی کے ہر میدان میں جرات وہمت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ہاری تحریک جو کہ صوبہ سندھ کی ایک مشہور تحریک ہاریوں کے ساتھ ظلم وبربریت کی داستان جو مسعود کھدر پوش کی ہاری ریوٹ میں تحریر ہو کر تاریخ میں محفوظ ہے۔

نسائی مزاحمت کی ابتداء مغربی دانشوروں کے مطابق مزاحمت کی تحریک کا آغاز میری وال اسٹون کرافٹ (Mary Wall Stone Craft) کی کتاب A windcation of the right of women سے ہوا جو ۱۷۹۲ء میں شائع ہوئی۔

میری وال اسٹون نے اس میں لکھا:

"ظالم اور استحصال پسند لوگ عورت ذات کو تاریکی میں رکھنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ ظالم تو انہیں غلام بنانے کے درپے ہوتے ہیں اور استحصال پسند اپنے ہاتھوں کا کھلونا۔ لہذا عورتوں کو چاہیے کہ وہ ان دونوں کے دام فریب سے ہوشیار رہیں۔"(۲۰)

اس دور میں ان کی باتیں جرات مندانہ تھیں اور بے باکی سے لکھی گئی تھیں اس تحریک کی دوسری علمبردار سمیون دی بورSimone De Beauvoir ہیں۔ انہوں نے کتابThe second sex تحریر کی اور ان کی تحریر کو باغیانہ اور ان منفرد کہا گیا۔ اس سلسلے کی تیسری کتاب ورجینیاوولف "A room of one's own" کے نام سے تحریر کی اس میں عورت کی آزادی کا اظہار کے بارے میں بات کی گئی ورجیناوولف کی کتابوں کو نسائی جدوجہد کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔ انہوں نے عورتوں کی عزت نفس کو جھنجھوڑا عورتوں میں بیداری پیدا کی۔

اردو ادب میں خواتین کا ادب ابتدا میں لکھا گیا اس میں زیادہ تر کام رومانی، تقلیدی اصلاحی رہا اور ان کی تحریروں کے موضوعات عصری رجحانات اور تقاضوں کے زیر اثر رہے۔ ان کے موضوعات میں اسلامی اور مشرقی، اقدار خیر و شر، عاشقوں مثالی خاندان کی تشکیل وغیرہ رہے۔ پھر وقت کا دھارا بدلا اور خواتین نے عہد کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں منفی اقدار سے اجتناب کیا اور فکر کے ساتھ ساتھ فنی اعتبار سے بھی ہی تبدیلی کو قبول کیا اور اس وقت ترقی پسند تحریک ایک نئے موڈ کے طور پر سامنے ائی اور خواتین کو ازادی فکر کا ماحول میسر آگیا۔ اردو افسانہ میں احتجاج و مزاحمت کی آواز بلند کرنے والی پہلی خاتون افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں قدامت اور توہم پرستی پر بات کی اور نئی قدروں کو جنم دیا۔ لیکن ڈاکٹر رشید جہاں مولویوں اور شدت پسندوں کی مخالفت کا شکار ہوئیں ان کی مخالفت صرف افسانے کی حد تک نہیں تھی بلکہ یہ تھی کہ اس سے پہلے کسی مسلمان خاتون نے ان موضوعات پر لکھا ہی نہیں تھا او ڈاکٹر رشید جہاں بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں کے بعد ممتاز شیریں اور پھر عصمت چغتائی نے اپنی تحریروں کے ذریعے مردوں کے معاشرے میں عورتوں کی آزادی کے لئے آواز اٹھائی ان کی تحریریں اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے نمونے ہیں۔ ان کے بعد اردو ادب میں قرۃالعین کا نام نمایاں طور پر نظر آتا ہے جنہوں نے کارمن اور گریسی کے بالمقابل تنویر فاطمہ سبیتااور "چائے کے باغ" کے خود گر اور "خود شکن" جیسے کردار تحریر کیئے۔ ان کے بعد آنے والی ادیباؤں میں خدیجہ مسرور، ہاجرہ مسرور، جیلانی

بانو، واجدہ تبسم، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ اور زاہدہ حنا نے اپنی تحریروں میں رہ جان کو فروغ دیا ان کی تحریروں میں اپنے سماج کے جاندار کردار ملتے ہیں۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمیٰ اپنے مضمون میں ان خواتین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ان تمام خواتین کی تخلیقات میں مغرب کی کورانہ نقالی نہیں ملتی بلکہ اپنے ملک اور سماج و تہذیب و معاشرت کے درمیان زیست کرتے ہوئے جاندار کرداروں کے ذریعے تانیثیتی کی فکر و احساس کو پیش کرنے کی کامیاب سعی ملتی ہے"۔ (۲۱)

خواتین نے اردو افسانے کو انسانی تجربات سے آشنا کرایا اور وسعت دی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد خواتین کی تحریروں میں مزاحمت اور احساسات کی شدت دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں اسالیب کا تنوع اظہار کی جرات کے روشن نشانات دکھائی دیتے ہیں۔ جدید افسانہ نگار خواتین کی تحریروں میں احتجاج کا لہجہ تیز ہوتا دکھائی دیتا ہے ان کے ہاں عورت وفا کی دیوی کی بجائے اپنے وجود کے احساس کے ساتھ دکھائی دیتی ہے اور ان کے ہاں اظہار کی شدت کی سطحیں ہیں اور ان میں کچھ کا لہجہ اور کچھ کا دھیما ہے۔ ترنم ریاض، زکیہ مشہدی شاہ، نگار عظیم، عمر جہاں، تبسم فاطمہ، صبوحی طارق، تسنیم فاطمہ، عروج فاطمہ، رخسانہ صدیقی کی تحریریں تازگی کے ساتھ تنوع لیے ہوئے ہیں۔ غزالہ قمر کا مجموعہ "چاند میرا ہے" میں ان کا اعتماد اور جرات کا بیان موجود ہے۔ افسانہ نگار غزالہ ضغیم اپنے افسانوں میں مرد حاوی سوچ کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ ثروت جہاں کے افسانوں میں عورت سماج کی ناانصافیوں کو برداشت تو کرتی ہے لیکن اپنی تقدیر مان کر قبول نہیں کرتی۔ نگار عظیم کے کرداروں میں عورت تھپڑ کھانے کے بعد شدید رد عمل کا اظہار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ تبسم فاطمہ کے ہاں بھی احتجاج اور مزاحمت کی صورت موجود ہے عورت کا باغی روپ دکھائی دیتا ہے اور اشرف جہاں کے افسانوں میں عورت کی تنہائی بے بسی مرد کی بے وفائی اعتنائی اور احتجاجی رویے ملتے ہیں۔ شائستہ فاخری جو عصر حاضر کی ایک جانی مانی افسانہ نگار ان کے افسانوں کی عورت اپنے قدموں پر کھڑی ہو کر سماج میں مثالی کردار نبھاتی ہے۔ عنبرین رحمان کی تحریروں میں عورت کے بے قدری، محرومی پر بھرپور لکھتی ہے۔ افسانہ نگاروں میں ایک نیا نام رخسانہ صدیقی ہیں ان کے افسانہ "سائبان" میں ایک کردار مینہ کا رویہ اور لہجہ بھی احتجاجی ہے۔

اردو ادب میں مزاحمت کی روایت

مزاحمت ہمارے ادب میں بسی ہوئی ہے جس دور میں اردو ادب کا آغاز ہوا وہ سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی زوال کا دور تھا۔ یہ ایک تاریک دور تھا اس میں مسلمانوں کا ساڑھے چھ سو سالہ اقتدار کا خاتمے کے ساتھ غلامی کے دور کا آغاز ہوا اور ان باتوں کا اثر خارجی کے ساتھ ساتھ داخلی رویوں پر بھی ہوا۔ یہ زوال اٹھارہویں صدی سے شروع ہو چکا تھا اور اس صدی کے آخر تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی جڑیں برصغیر میں گہری ہو چکی تھیں انگریزوں کا سلوک ہندوستانی ملازمین سے سخت ہو چکا تھا۔

رشید امجد اپنے مضمون "اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت" میں لکھتے ہیں:

> "دہلی میں داخل ہونے کے بعد انگریز فوجوں نے ظلم و بربریت کا جو بازار گرم کیا اس نے تاتاریوں کے حملہ بغداد کی یاد تازہ کر دی۔ دلی کے گلی کوچوں میں خون کی ہولی کھیلنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی عصمت دری بھی کی گئی۔"(۲۲)

۱۸۵۷ء کے بعد ایسی فضا نے جنم لیا جو پہلے صاحب اقتدار تھے وہ تمام ضروریات کے بھی محتاج ہو گئے۔ یہ محتاجی صرف اقتصادی نہیں تھی بلکہ ذہنی اور فکری بھی تھی۔

> "وہ شہر جو صدیوں سے آباد چشم زدن میں ویران ہو گیا اس سرزمین ویران میں قدم نہ رکھا جاتا تھا۔"(۲۳)

اس صورتحال نے تمام سیاسی، معاشی و ثقافتی اقدار کو متاثر کیا اور ہم اس کے اثرات کو اس دور کے ادباء و شعرا کی تخلیقات پر محسوس کر سکتے ہیں شہر آشوب میں سودا، ناجی حاتم اور کئی دوسرے شعرا نے لکھا اور ان کے اشعار میں عصری عکاسی کے علاوہ مستقبل کے خدشات بھی ہیں۔ میر کے دل کی تباہی اصل میں شہر کی تباہی ہے میر کے بعد غالب کے ہاں ایک برباد چمن اور اجڑی تہذیب کی تصویر ہے۔ انگریز حکومت "فورٹ ولیم کالج" کے ذریعے اردو ادب میں ترجیحات نمایاں کر چکا تھا اور اردو زبان و ادب پر اپنا اثر چھوڑ چکا تھا زبان و ادب کو اپنے پالیسی کے تحت چلانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس وقت برصغیر کے مسلمان تین حصوں میں بٹ چکے تھے۔

* ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جو اس صورتحال کو نہیں سمجھتے تھے اور نئی حکومت سے مفاہمت نہیں کرنا چاہتے تھے وہ انگریزوں کو برا سمجھتے تھے۔

* دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو انگریز حکومت سے مفاہمت چاہتے تھے اور انگریز کی ثقافت اور علوم کو اپنانا وقت کی ضرورت سمجھتے تھے۔
* تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو احتیاط سے تمام صورت حال کو جانچتے تھے اور وہ اپنی ثقافت کو برقرار رکھتے ہوئے انگریزی کے ذریعے نئے علوم سیکھنا چاہتے تھے۔ انیسویں صدی کے آخر تک فکری رجحانات تبدیل ہونے لگے قدیم صورتحال نے جدید رویوں کو جنم دیا اور نئے عہد میں بہت سے فکری رجحانات میں بدلاؤ آیا اور جدید و قدیم، بدعت و سنت، مذہب و سائنس، عقل و جبلت، گدائی و شاہی کی آویزش سے نئے مباحث پیدا کیئے۔

> "۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء کے درمیانی عرصہ کا جائزہ لیں تو دو نمایاں رجحان سامنے آتا ہے ایک یاسیت اور آہ و بکا کی منتشر لہریں جن کے درمیان کہیں کہیں جذبہ جہاد کی کمزور سی صورت بھی موجود ہیں اور مذہبی اصلاح کاروں کی کوششیں دوسرا رجحان مقصدیت کا جوش و خروش، دبستانِ سرسید اور اس کے رفقا حوالے سے سامنے آتا ہے انجمن پنجاب بھی اسی رجحان کا معاون تھا۔"(۲۴)

غزل میں یہ دونوں رجحان ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ نظم میں محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی اور شبلی نمایاں ہیں اور غزل میں داغ اور امیر مینائی نمایاں نظر آتے ہیں۔ نثر میں اس جدید دور کی ترجمانی سرسید کے دبستان سے ہوئی ڈپٹی نذیر احمد اردو داستان کو تصوراتی دنیا سے نکال کر حقیقتوں کی پہچان کرائی۔ بیسویں صدی کا آغاز زندگی کی جہد میلانات اور مثبت اقدار کو ساتھ ملایا اور اس صدی ہی میں اردو ادب میں انقلابی رویہ روشناس ہوا سرشار اور اکبر الہ آبادی کے حوالے سے نیا رجحان سامنے آیا جس میں سرشار نے طنز اور اکبر الہ آبادی نے طنز و ظرافت کے ذریعے اس دور کی عکاسی کی اور اکبر الہ آبادی سرسید کی تعلیمی حکمت عملی سے مطمئن نہ تھے ان کا خیال تھا کہ جدید تعلیم ہو لیکن وہ علی گڑھ کی تعلیم سے مطمئن نہیں تھے ان کے خیال میں یہ تعلیم مسلمانوں کو عارضی فائدہ پہنچائے گی۔ بیسویں صدی اپنے ساتھ ساتھ زندگی کی مثبت اقدار اور جہد کے میلانات سامنے آئے دراصل یہ صدی ادبی اور فکری طور پر اقبال کی صدی ہے اس پر علامہ اقبال کی فکر اور فن کے اثرات ہیں علامہ اقبال نے مغربی فکر اور کلچر کو بغور مطالعہ کیا اور پھر مشرقی مسائل کا علاج دریافت کیا اسی لئے علامہ اقبال کی شاعری منفرد ہے۔ اس صدی کی ابتدا سے نو آبادیاتی نظام

عروج پر تھا۔ سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کی بیداری کے لئے بہت کام کیا لیکن ان کی حکمران دوستی نے اس کام کو ایک حد سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

اس بارے میں رشید امجد لکھتے ہیں:

"علامہ اقبال نے شاعری کو داخلی یوٹیاپیا سے نکال کر جیتی جاگتی جدوجہد کرتی دنیا سے ہم آہنگ کیا۔"(۲۵)

اقبال کے بعد چکبست نے اردو شاعروں کو ایک نیا ذائقہ دیا۔

بقول رشید امجد:

> "چکبست کی شاعری کے زبردست محرکات میں چند چیزیں قابل ذکر ہیں، حب وطن اور قوم کی محبت، تاریخی واقعات، منظر اور مذہبی عقائد یا کائنات کے حقائق کا انکشاف۔"(۲۶)

چکبست کے بعد حسرت موہانی وہ شاعر ہے جنہوں نے غزل کے لیے نیا راستہ کھول کر اس میں تازہ روح پھونک دی۔ اقبال کی بعد رومانیت پسندی کا رویہ مقبول ہوا رومانوی شعرا میں اختر شیرانی، عظمت اللہ حفیظ، اور حامد اللہ افسر شامل ہیں۔ عظمت اللہ نے فارسی کو چھوڑ کر ہندی کی بحروں کو اہمیت دی اس طرح ان کی شاعری میں نیا پن آیا اور اس سلسلے میں ان کا کردار بہت اہم ہے۔ رومانوی تحریک کے رد عمل کے طور پر ترقی پسند خیالات اور حقیقت نگاری کا رجحان پیدا ہوا۔ حقیقت پسندی کے اس دور میں اقبال کی نظمیں "طلوع اسلام" اور "خضر راہ" اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں مسلمانوں میں مستقبل کی راہ تلاش کرنے میں معاون ثابت ہوئیں۔ اس کے علاوہ جوش کی نظم "زمانہ جنگ" میں فکر کا ایک نیا انداز نظر آیا اور یہ نظم بہت اہمیت کی حامل ہے۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ترقی پسند تحریک نے سوچ کا دھارا تبدیل کیا اور اردو ادب میں ایک انقلاب آفرین رویہ سامنے آیا۔ اور اردو ادب نے افسانے میں "انگارے" نے جرات اظہار کو جنم دے کر ترقی پسند تحریک کی سوچ کو آگے بڑھایا۔ اور اس کا اثر شاعری پر بھی ہوا۔

اس صدی کے بارے میں رشید امجد لکھتے ہیں:

> "اس نے ہمیں چوٹی کے کئی ادیب اور بڑی مقدار میں اعلی ادب دیا اس نے اگر ایک طرف معاشی و سماجی نابرابری کے خلاف ضمیر کو جھنجھوڑا تو دوسری طرف قوم کی آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لیا۔"(۲۷)

ترقی پسند تحریک کی بدولت ہندوستانی عوام کو مل کر جدوجہد کرنے کا شعور ملا اور اس تحریک کے تحت بہت سے ادیب سامنے آئے جن میں نوجوان اور بزرگ سب ہی شامل تھے فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، جان نثار اختر ترقی پسند تحریک کے اہم شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ سب سے موثر آواز فیض کی سمجھی جاتی ہے ان کی یہ بڑی خوبی ہے کہ انہوں نے غزل کے کلاسیکی مزاج کے ساتھ ساتھ ترقی پسند رویوں کو بھی قائم رکھا۔ بیسویں صدی میں نئے زاویے اور رویے کیساتھ جبر و تشدد کی سامراجی صورت بھی موجود رہی اس صدی میں پوری دنیا میں بدلاؤ آیا اور نئے سیاسی و سماجی رویے سامنے آئے اور ان رویوں نے ادبی و فکری دنیا میں نئے در کھولے۔ اس صدی میں تین بڑے واقعات رونما ہوئے۔

۱۔ جنگ عظیم اوّل ۱۹۱۴ء

۲۔ انقلاب روس ۱۹۱۷ء

۳۔ جنگ عظیم دوّم ۱۹۳۹ء

ان واقعات کی وجہ سے بیسویں صدی بہت سے مسائل سے دوچار ہوئی۔ لیکن اس صدی نے اردو ادب کو بہت سے بڑے نام دیئے جنہوں نے غزل و نظم کو نئی فکر اسالیب اور فنی رویوں سے روشناس کرایا۔ ان اہم ناموں میں حسرت موہانی، فانی، یگانہ، جگر مراد آبادی، میراجی، جوش ملیح آبادی، نون م راشد، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، وزیر آغا، اختر شیرانی اور فیض احمد فیض ہیں۔ ان کے ہاں فکر اور فن کے نئے انداز میں ملتے ہیں۔

۱۸۵۷ء میں جو سیاسی خوف جبر و تشدد کی فضا قائم تھی اس کا تسلسل بیسویں صدی میں بھی جاری رہا۔ اور رد عمل، مزاحمت اور احتجاج کی جو فضا ہماری شاعری میں موجود تھی وہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہی کیونکہ آزادی کے بعد خواب پورے نہ ہوئے جن کی تمنا میں آزادی حاصل کی گئی تھی۔ طبقاتی جبر اور سماجی ناانصافی کا دور جاری رہا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۸ء کہ مارشل لاء لگا اور پھر بعد عوامی تحریک چلی جو ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء پھر ۱۹۶۸ء تک ۱۹۸۸ء میں پھر مارشل لاء لگا دیا اور آمریت اور جبر کی فضا کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی اور انہی وجوہات کی بنا پر معاشرہ تہذیبی، سماجی، اخلاقی، تنزلی کا شکار رہا۔ اس بارے میں منیر نیازی نے کیا خوب کہا ہے۔

منیر اس ملک پہ آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

جدید افسانے میں مزاحمت کی روایت

اردو میں مختصر افسانہ انگریزی ادب سے آیا اور اس کو موپساں اور چیخوف نے فن کا درجہ دیا۔ اردو میں افسانے کا رشتہ قدیم قصہ کہانی کی روایت سے ملتا ہے اردو صحافت کے فروغ پا رہی تھی تو اس وقت رسائل کے لیے انگریزی تراجم کی ضرورت محسوس ہوئی جب ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو افسانے کو بھی ترقی ملی۔ افسانے کے ارتقا میں "رسالہ اودھ پنچ" اور "انتخاب لاجواب" میں شائع ہونے والی کہانیوں کا بھی ہاتھ ہے. انیسویں صدی کے آخر میں مغربی افسانوں کے تراجم بھی ہو رہے تھے افسانے میں ابتدا ہی سے احتجاج اور مزاحمت کی فضا قائم تھی۔ ابتدا میں دو اہم افسانہ نگار نظر آئے ہیں وہ منشی پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم ہیں ان کے ہاتھ میں افسانے کی ڈور تھی سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں رومانیت کی خیالی دنیا اور منشی پریم چند کے افسانے حقیقت سے قریب تر تھے۔ مزاحمت و احتجاج کے تمام عکس زمین سے جڑے ہیں مزاحمت اور احتجاج کے تمام رنگ اسی مٹی سے ملتے ہیں زمین زرخیز نہ ہو یہ پودا اسی مٹی میں بنتا ہے۔ سوز وطن سے کفن پریم چند نے اپنے افسانوں میں احتجاج کی فضا قائم کیا اور افسانہ "سوز وطن" میں جو درد پہناں تھا اس نے افسانے میں نئی روح پھونک دی اور یہ ایک انقلابی قدم ثابت ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے ۱۹۳۴ء نئے لکھنے والوں سماجی نظریہ فراہم کیا اور یہ بہت تیزی سے آگے بڑھی اور سماج کیلئے اور پسماندہ طبقے کی زندگی ادب کا حصہ بن گئی۔ ۱۹۴۷ء کی آزادی وطن کی جدائی کے ساتھ عمل میں آئی۔ مذہبی جبر نے لکھاریوں کو بہت سا مواد فراہم کیا بہترین افسانے لکھے گئے جن میں مزاحمتی رویہ احتجاج، بغاوت اور انقلاب کا مزاج موجود تھا۔ منٹو نے افسانے کو نئی معنویت عطا کی ان کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ، موذیل، ٹھنڈا گوشت، پشاور ایکسپریس اس دور کے افسانے بہت اہم ثابت ہوئے۔ منٹو نے فسادات کے موضوع پر بھی افسانے لکھے عصمت چغتائی بھی منٹو کے ساتھ ہی چلتی دکھائی دیتی ہیں تقسیم کے بعد کرشن چندر، ہم وحشی ہیں، امرتسر، لاجونیتی، بیدی، جڑیں، عصمت چغتائی "آخ تھو" پریم ناتھ کو، کالی رات، سید احمد "یا خدا" قدرت اللہ شہاب، پرمیشور، احمد ندیم قاسمی، بھاگ ان پردہ فروشوں سے، راجندر سنگھ بیدی، منٹو اور عصمت چغتائی کے افسانوں میں احتجاج موجود تھا۔

جدیدیت سے پہلے اردو افسانے میں مزاحم و احتجاج کے واضع نقوش تھے۔ ادب کا رشتہ سماج سے ہے اور ادب میں سماج کی جھلک نظر آتی ہے۔ انتظار حسین اور قرۃ العین نے اساطیر سے کام لیا انتظار حسین کا "زرد

کتا" اور قرۃالعین حیدر کا افسانہ "کیکٹس" میں ماضی کے بازیافت موجود ہے ۱۹۶۰ء کے قریب قریب ترقی پسند کے رد عمل کے طور پر جدیدیت کی لہر نظر آتی ہے پھر تجریدی اور علامتی افسانے لکھے گئے۔
شمس الرحمٰن فاروقی اس بارے میں کہتے ہیں:

"تاریخ ہمیشہ ایک سیدھی لکیر پر سفر کرتی ہیں لہذا بعد میں آنے والا زمانہ پچھلے زمانے سے آگے بڑھا ہونا ترقی کی دلیل ہے۔"(۲۸)

جدیدیت کی بحر کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں بلراج، سریندر پرکاش اور احمد ہمیش ہیں غیاث احمد گوی کا افسانہ "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" بہت کامیاب ہوا۔ اس عہد میں انور عظیم، اقبال میتن، جیلانی بانو کلام حیدری، نے اپنے افسانوں سے متاثر کیا احتجاج کے لیے بیانیہ یہ ضروری ہوتا ہے اسی لیے اس دور میں بہت سے قلم کار جدیدیت سے جڑ گئے لیکن کامیاب نہ ہوئے ۱۹۸۰ء میں اردو افسانہ بیانیے کی طرف لوٹا آیا اس دور میں بہت سے افسانہ نگار سامنے آئے ہیں ان میں ترقی پسند فکر والوں کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور ماجدیدیت پر لکھنے والے بھی موجود تھے اور بہت سے ایسے قلم کار ابھی ہیں جن کا کسی تحریک سے کوئی تعلق نہیں رہا وہ افسانہ نگار جن کے تحریروں میں کسی نہ کسی صورت میں مزاحمتی رویہ موجود رہا ان میں منشایاد، عابد سہیل، انور امام، زکیہ مشہدی، جیلانی بانو، رتن سنگھ، اقبال مجید، اسلم، جمشید پوری، انور قمر، صدیق عالم، احمد صغیر، اور شاھد اختر شامل ہیں۔ اکیسویں صدی میں افسانوی ادب میں نئے موضوعات ورجحانات شامل ہو رہے ہیں۔ فرد سے معاشرتی اور معاشرے سے آگے اب پوری دنیا ادب کا موضوع ہے جتنی بھی ایجاد و دریافت ہو رہی ہے آج کا افسانہ ان سے آپ اپنے موضوعات لیتا ہے افسانوی ادب میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں کہانی کا کینوس تمام براعظموں تک پھیل گیا ہے اور ترقی کی جانب گامزن ہے۔

۱۹۷۰ء سے لے کر آج تک کے افسانے نے نئے تیور کے ساتھ زندگی کا ہاتھ تھاما ہے انتظار حسین، نیر مسعود، عبداللہ حسین، عابد سہیل، مستنسر حسین تارڑ، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، ترنم نسیم ریاض، نسیم حجازی، رشد امجد، بلراج بخشی، اے حمید، احمد ندیم قاسمی، رضیہ بٹ، انیس ناگی، شوکت صدیقی، اور مرزا حامد بیگ جیسے بہت سے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے اردو کا ایسا فکشن کی حیثیت کو بدلنے کی شعوری کوشش کی۔ اور اردو افسانہ ایک نئی منزل کی جانب رواں دواں ہے اور یہ افسانہ نگار عبد الصمد، حسین الحق، جابر حسین، احمد صغیر، شائستہ فاخری، رخسانہ صدیقی، قاسم خورشید، اپنے موضوعات اور وسیع کینوس کی وجہ سے ہمیں نئی دنیا سے روشناس کرا رہے ہیں۔ ان کے موضوعات میں بڑھتی ہوئی آبادی، کشمیر کا مسئلہ فرقہ واریت

بم دھماکے رشوت ستانی سیاسی قدروں کی پامالی تشدد اور جنسی تشدد کی بھیانک صورتیں، غربت، جہالت استحصال، لسانی تشدد، منشیات، اخلاق اقدار کی پامالی، بے حیائی، بے روزگاری، لاقانونیت وغیرہ افسانے عہد حاضر کی حقیقتوں کی ترجمانی کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے مسائل سے آگاہ کر رہے تھے۔

شخصیت کا تعارف

شہناز شورو سندھ کے علاقے میر پور خاص کے ایک گاؤں میں ۱۷ نومبر ۱۹۶۹ء پیدا کو پیدا ہوئی (اپنے دادا کے نام سے موسوم گوٹھ سائیں داد شورو) ان کے گاؤں کا ماحول سادہ اور اتفاق و یگانگی کی مثال تھا جہاں لوگ امن کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ اس گاؤں کی آبادی ہندو، مسلم سندھی، مہاجر، اور پٹھانوں پر مشتمل تھی ان کا نام شہناز شورور کھا گیا گھر میں شانی کہہ کر پکارا جاتا تھا اور ان کے والد صاحب شانل پری کہہ کر پکارتے تھے اور دوست شانو ہی کہتے تھے۔ شہناز شورو کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے ہے والد صاحب زمیندار تھے اور سیاسی ایکٹوسٹ بھی۔ والدہ کا تعلق سکھ گھرانے سے تھا ان کا نام بلونت کور رکھا تھا دائرے اسلام میں آنے کے بعد ان کا نام غدار بیگم رکھا گیا۔ گھر کی فضا میں ادبی ذوق تھا والدین ادبی ذوق کے مالک تھے۔ والد صاحب سندھی شعراء بالخصوص شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مرید تھے۔ ان کے ایک ماموں بھی شاعر تھے لیکن بھری جوانی میں ہی وفات پا گئے اور والدہ ادبی مجلے اور ڈائجسٹ پڑھا کرتی تھی شہناز صاحبہ کل چھے بہن بھائی ہے ان کا نمبر پانچواں ہے بہن بھائیوں کو ادب سے لگاؤ ہے لیکن لکھتی صرف شہناز ہیں۔

ابتدائی تعلیم کا آغاز گورنمنٹ طارق پرائمری اسکول سے کیا۔ کے ذریعے اور یہاں چار جماعت پاس کیئں اور پانچویں کا امتحان گورنمنٹ گرلز اسکول میر پور خاص سے پاس کیا اور میٹرک گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میر پور خاص سے ۱۹۸۶ء میں کیا ۱۹۹۱ء ابن رشید کالج میر پور خاص سے گریجویشن کی سند حاصل کی ایم اے انگریزی ادب میں یونیورسٹی آف سندھ جامشورو سے ۱۹۹۵ء میں کیا اور ۱۹۹۵ء شہناز صاحبہ کی شادی اکبر لغاری سے ہوئی۔ یہ ان کی پسند کی شادی تھی اور اکبر صاحب کو خود ہی پرپوز کیا تھا۔ شہناز نے پبلک سروس کا امتحان ۱۹۹۶ء میں پاس کیا اور پہلی تقرری ماروی گرلز کالج بدین ہوئی اور یہاں تین ماہ کا عرصہ رہیں۔ ان کے شوہر اکبر لغاری بھی سول سروسز میں تھے۔ وہ جہاں جاتے شہناز صاحبہ بھی اپنا تبادلہ اس جگہ پر کرا لیتیں۔ اس طرح ان کے تبادلے بھی مختلف جگہوں پر ہوئے۔ جب اکبر صاحب A.D.M دادو ہوئے تو انھوں نے بھی اپنا تبادلہ گورنمنٹ گرلز کالج دادو میں کرایا۔ اس کے بعد شہناز صاحبہ اکبر لغاری کے ہمراہ بدین آگئیں

اور ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۱ء تک بدین میں رہیں مارچ ۲۰۰۱ء میں صفیہ گرلز کالج کراچی آ گئیں۔ ۲۰۰۱ء میں یونیورسٹی آف سندھ جامشورے سے ایم اے اُردو کیا۔ ۲۰۰۲ء میں یونائیٹڈ کنگڈم یونیورسٹی سے English language Teachingمیں ماسٹر کی سند حاصل کی۔ شہناز نے باقی تعلیم شادی کے بعد حاصل کی۔ ۲۰۰۸ء میں واپسی ہوئی اور یونیورسٹی آف پارک انگلینڈ سے PHDوومن سٹڈیز میں حاصل کی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے بی ایڈ ۲۰۱۲ء میں کیا اور اسی سال لندن ٹیچر ٹریننگ کالج یونائیٹڈ کنگڈم سے سرٹیفیکیٹ حاصل کیا۔

ایوارڈز:

۱۹۹۲ء مقابلہ نویسی-شہید شاہنواز بھٹو میموریل ایوارڈ

۲۰۱۰ء-مرزا قلیچ بیگ ایوارڈ

۲۰۱۳ء-دی چارلس ویلز پاکستان ٹرسٹ ایوارڈ

عائلی زندگی

شہناز شورو کے شوہر اکبر لغاری بحیثیت سیکرٹری کلچر ڈیپارٹمنٹ سندھ حکومت میں کام کر رہے ہیں۔ فلسفے اور ادب کے آدمی ہیں۔ سندھی زبان میں لکھتے ہیں۔ ان کی سات کتابیں چھپ چکی ہیں اور دو کتابوں کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ ان کی ایک کتاب " فلسفے کی تاریخ" کے نام سے شاھد ثنائی نے ترجمہ کیا۔ ان کی دوسری کتاب " ادبی تنقید " کے نام سے شہناز شور نے ترجمہ کی ہے جو ابھی زیر طبع ہے۔ اکبر لغاری صنفی امتیازات کے خاتمے کے بارے میں ٹھوس نظریات رکھتے ہیں۔ شہناز کے دو بچے ہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی کینیڈا میں مقیم ہیں۔ اور ۲۰۱۴ء سے اب تک پاکستان نہیں آئیں۔ ان کے نزدیک اچھا فکشن اور یہ رائٹر وہ ہے جو حساس ہو اور اپنی بات کہنا جانتا ہوں اور تحریر میں کچھ نیا پن ہو۔ حق اور سچ اور انسانی مسائل کی سمجھ ہو اور تعصب سے دور رہے۔ تنقید کے میدان میں محمد علی صدیقی، اور روف نیازی کی صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ فیض پسندیدہ شاعر ہیں۔" نسخہ ہائے وفا" پسندیدہ کتاب ہے جو دوران سفر ہمراہ ہوتی ہے۔ منٹو اور کرشن چندر کی مداح ہیں۔ بیرونی ادب میں شیکسپیر شیلے اور میلان کنڈیرا کو سراتی ہیں۔

ادبی سفر

شہناز شورو ایک حساس طبیعت رکھتی ہے اپنے گرد و پیش سے باخبر ہیں ارد گرد کے واقعات کا گہرا اثر لیتی ہیں وہ اپنے واقعات سے بچوں کے لیے کہانیاں چنتی تھیں اور یہ کہانیاں بچوں کے رسائل اور اخبارات میں بچوں کے صفحات میں شائع ہوتی تھیں۔ بچوں کی کہانیاں لکھتے لکھتے ان کی تحریروں میں سنجیدگی آگئی اور انھوں نے افسانے تراجم اور تنقید سب پر دل جمی سے کام لیا۔ ان کی تحریریں مختلف اخبارات میں شامل ہوتی رہیں۔ انہوں نے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ماہنامہ " صریر " سے کیا ان کا پہلا افسانوی مجموعہ " لوگ لفظ اور انا "۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آیا. ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ " زوال دکھ " کے عنوان سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ شہناز افسانہ نگاری کے ساتھ کالم نگاری اور تراجم بھی کرتی ہیں انہوں نے کئی کتابوں کے تراجم بھی کیے اور ۲۰۰۹ء میں سندھی زبان کے دانشور حیدر علی لغاری کے مضامین جو شاہ عبداللطیف پر لکھے گئے تھے ان کا اردو ترجمہ کیا اور " سوز و ساز و لطیف " کے نام سے شائع کیا۔

مرزا قلیچ بیگ کی سوانح عمری کو اردو کے پیرہن میں ڈھالا ان کو بچپن سے ہی کہانیاں اور افسانے پڑھنے کا شوق تھا اسی شوق کی بنا پر میٹرک تک افسانے ناول کے ساتھ ساتھ روسی ادب اور برطانوی ادب کے تراجم اور کلاسیکی اردو ادب کے طلسم قصّے ہوشربا پڑھ چکی تھیں۔ لکھنے کا آغاز ہو چکا تھا ان کی حساس طبیعت اور گہری سوچ لکھنے کا باعث بنی۔ ان کی پہلی کہانی روزنامہ " اخبار امن " میں بچوں کے صفحے پر اسی کی دہائی میں شائع ہوئی اور یوں یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ اس سلسلے میں مہہ نازر حمن صاحبہ نے بہت حوصلہ افزائی کی " ہزاروں خواہشیں ایسی " کے عنوان سے کالم بھی لکھے اخبارات کے علاوہ " ساتھی "، " ٹوٹ بٹوٹ " اور " ہونہار " اور اخبار پاکستان میں کہانیاں شائع ہوئیں۔ بچوں کے لئے لکھی گئی کہانیاں پچاس کے قریب ہیں اور مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ " لہروں کی دھوپ " ڈاکٹر فہیم اعظمی کے ماہنامہ " صریر " میں شائع ہوا.

حوالہ جات

۱۔ روبینہ سہگل "عورت اور مزاحمت" عثمان بلاک نیو گارڈن، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳

۲۔ ایضاً، ص ۲۹

۳۔ ایضاً، ص ۳۰

۴۔ ایضاً، ص ۳۰

۵۔ طارق علیم، ڈاکٹر، "اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمت" انجمن ترقی اردو پاکستان، گلشن اقبال کراچی ۲۰۱۸ء، ص ۵۰

۶۔ ایضاً، ص ۵۲

۷۔ ایضاً، ص ۵۳

۸۔David jofferess postcolonica clture liberaction and trangsfornation. University, of toronolo 10:10 pm, 2008

۹۔ ابرار احمد "مزاحمتی ادب" مشمولہ، اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت، اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان ۱۹۹۵ء، ص ۴۸

۱۰۔ Urdu news.com, 11:20 pm, Friday13 October2017

۱۱۔mhap, 10:00 pm 27june 2018

۱۲۔ ولیم اوگلس، "بنیادی انسانی حقوق کا مسئلہ" مکتبہ میری لائبریری لاہور ۱۹۲۵ء

۱۳۔ سید عمران بخاری، ڈاکٹر، مزاحمت، M Facebook. Com/ Shubha.pk ۱۹ اگست ۲۰۱۰ء 11:50 pm

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ نعیم بیگ "مزاحمتی ادب اور اس کی تشریحات" www.aikrozan.com، ۱۹ اکتوبر ۲۰۱۲ء 10:00 pm

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ لفظ نامہ، lafznama.com، فروری ۲۰۱۲ء 12:15 pm

۲۰۔ شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر، تانیثیت اور اردو کی نئی افسانہ نگار خواتین http://lafzanama.com 10:50 am

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر "اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت" مشمولہ، اردو ادب، احتجاج اور مزاحمت کے رویے، اردو اکادمی دہلی، ص ۵۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۵۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۶

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۷

۲۷۔ شمس الرحمن فاروقی "افسانے کی حمایت میں مشمولہ"، "اردو افسانہ روایت اور مسائل"، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس لال کنواں دہلی ۲۰۱۳ء

باب دوم

شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمت کے سماجی عناصر سماج

عام الفاظ میں افراد کا مجموعہ سماج کہلاتا ہے۔ سماج میں افراد کی بنیادی ضروریات زندگی ایک دوسرے سے مل جل کر رہنے میں پوری ہوں۔ سماج کی تاریخ پڑھنے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جب زمین پر آیا تو جب بھوک نے ستایا تو اس کو کھانے پینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس نے درختوں کے پتوں سے بھوک کو مٹایا۔ اس کی پہلی ضرورت بھوک اور خوراک کی تلاش تھی جب موسم کی سختی نے پریشان کیا تو تن ڈھانپنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو پتوں اور درختوں کی چھال سے ڈھانپنا شروع کیا۔ انسان نے اپنی تمام جدوجہد اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لئے کیں موسم کی سختی اور جنگلی جانوروں سے بچاو کے لئے غاروں میں پناہ لی۔ پتھر کو رگڑ کر آگ جلائی لکڑی اور پتھر سے جانوروں کا شکار کرنا شروع کیا اور اس کی کھال سے بدن کو ڈھانپنے لگا۔ رفتہ رفتہ انسان اپنی ضروریات کے حصول کے لئے دوسرے انسانوں کے قریب ہوتا گیا۔ جب فرد دوسرے فرد کے قریب ہوا تو ضروریات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہوا مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد کرنے لگا اور اس طرح باہمی ضروریات پوری ہونے لگیں شروع شروع میں انسان کو صرف اپنی ہی فکر تھی وہ صرف اپنے بارے میں سوچتا تھا۔ اپنا شکار کرنا تن ڈھانپنا اور سو رہنا۔ لیکن جب دوسرے فرد کے قریب آیا تو ہمدردی اور مدد کا جذبہ بیدار ہوا اور مل جل کر رہنا سیکھ لیا رفتہ رفتہ افراد خاندان قبیلے بننا شروع ہوے اور اکٹھے رہنے لگے پتھر اور لکڑی سے اوزار بنائے گئے اور جانوروں کا شکار ان اوزار کی مدد سے آسان ہو گیا اور جانوروں کی کھالوں سے تن ڈھانپا مل جل کر زندگی کی ضروریات کو حاصل کیا جب مل جل کر رہنے سے ضروریات زندگی حاصل کرنا آسان ہوا تو مل جل کر رہنے لگا اور اسطرح سماج کی بنیاد رکھی۔

انسان نے اپنی ضروریات زندگی تحفظ اور خطروں سے نبرد آزما ہونے کے لئے سماج بنایا اور انسان کو اسی سماج سے پہچان ملی۔ سماج ہی کی بدولت زندگی گزارنے کے ذرائع وجود میں آئے۔

سماج سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ سماج دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ رسم آج رسم سے مراد اکٹھا کے ہیں اور آج آج رہنے کے معنی دیتا ہے۔ سماج کے معنی ہیں اکٹھا رہنا یعنی جہاں افراد اکٹھا ہو کر رہنے لگیں وہیں پر سماج بن جاتا ہے۔ سماج ہی سے فرد کی پہچان ہے اور فرد ہی سے سماج ہے۔ کوئی بھی فرد سماج کے بغیر نہی رہ سکتا افراد کے ملنے سے سماج کا وجود ہے ماہرین سماجیات نے سماج کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

جارج سمیلGeorge Simmel

"سماج ان لوگوں کا گروہ ہے جو آپس میں باطنی طور پر ایک دوسرے سے وابسطہ ہوں۔" (۱)

فیرڈ چائلڈ

"سماج انسان کا ایسا گروہ جو اپنے بہت سے ضروری مقاصد جن میں لازمی طور پر خود کی حفاظت پیٹ بھرنا یا خود کی حفاظت، پیٹ بھرنا یا کپڑا ہے۔ان سب چیزوں کو پورا کرنے میں مدد کرتا ہے۔" (۲)

مکالئور

"سماج سماجی رشتوں کا ایک جال ہے۔"(۳)

ماہرین کے نظریات کو دیکھتے ہوئے سماج کا جو نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے وہ ایسا گروہ جس میں فرد کا افراد سے رشتہ ہے اور وہ ایک دوسرے پر اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں۔ایک دوسرے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ہمدردی اور قربت کے رشتے تشکیل دیتے ہیں اور رشتوں کا یہ بندھن ہی سماج کی خوبصورتی ہے فرد کی پہچان سماج کے ہونے سے ہے فرد اور سماج ایک ہی حقیقت کے دورخ ہیں اور سماج کی حقیقت یہی ہے کہ وہ افراد کا مجموعہ ہے ہے۔ڈاکٹر عبد القادر عمادی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"جب افراد مشترک مفادات کے لئے سماجی بین عمل کے کسی مخصوص نظام میں منسلک ہو جاتے ہیں تو ان کے اس اجتماع کی وجہ سے سماج وجود میں آتا ہے۔"(۴)

انسانی بچہ جب دنیا میں آتا ہے تو مجبوری اور لاچاری کے عالم میں ہوتا ہے۔اس کو جسمانی اور جذباتی بالیدگی کے لئے کافی مدت اور دوسروں سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔اور یہ سب کچھ ایک منظم سماجی زندگی کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے۔ سماج میں رہتے ہوئے فرد ایک دوسرے سے ہمدردی چھوٹوں سے پیار بڑوں کا احترام سیکھتا ہے اور اپنے اور اپنے گھر والوں کا تحفظ اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اور پھر یہی میں رہنے کے لئے ان قدروں کا قائم رہنا بہت ضروری ہوتا ہے اور یہ تمام قدریں اور قانون ایک سماج کی پہچان بن جاتی ہیں۔

فرد ہی ایک سماج کی تشکیل کرتا ہے اور فرد اور سماج ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں سماج کا مجموعی رویہ اس میں بسنے والے لوگوں کا عکس دکھاتا ہے اور افراد کے فکری و تخلیقی اور تہذیبی رویے سماج کی پہچان ہوتے ہیں فرد کے سماج میں رہنے کے لئے کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور اسی طرح سماج میں فرد کے حقوق بھی ہوتے ہیں۔ سماج میں بسنے والے لوگوں کے لئے سماج کچھ قدر اور قانون وضع کرتا ہے جن کو ماننا عمل کرنا فرد کی ذمہ داری میں شامل ہے ان ذمہ داریوں کو نبھا کر فرد معاشرے کا اچھا شہری بن سکتا ہے ایک بہتر سماج میں فرد کی بہتری پنہاں ہوتی ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک بہتر سماج ہو لیکن اس میں بسنے والے افراد کی حالت ابتر وجب افراد کی زندگی بہتر ہو گی تو سماج بھی بہتر ہو گا انسانی رویے یے سوچ نظریات اور رجحانات سماج میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں فرد سماج پر زندہ نہیں ہوتا اور اپنی ضروریات اور علم سے اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے طریقے کھوجتا رہتا ہے اور جیسے جیسے سماج کی تہذیب اور ثقافت میں تبدیلی ہوتی ہے ویسے ویسے سماج تبدیلی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے سماج میں تبدیلی نہ ہو تو سماجی جمود کا شکار ہو جائے اور ختم ہو جائے یہ تبدیلی گو کہ بہت آہستہ ہوتی ہے لیکن سماج کی بقا کے لیے بہت ضروری ہے اور فرد اور سماج آپس میں لازم و ملزوم ہیں. اس بارے میں ارسطو نے کہا۔

> "انسان فطری طور پر سماجی جانور ہے جس کا گزارا معاشرے کے بغیر نہی ہو سکتا اگر کوئی خود کو معاشرے سے بیگانہ رکھتا ہے تو یا پھر حیوان ہے یا پھر دیوتا۔ " (۵)

انسان کی فطری ضروریات کو ایک سماج یا گروہ پورا کرتا ہے ہے جو تنہا رہ کر نہیں کی جا سکتیں سماج میں فرد پر کچھ ذمہ داریاں بھی عاید ہوتی ہے جس سے معاشرے میں نظم قائم رہتا ہے سماج میں موجود ہر فرد کی اہمیت ہوتی ہے اور فرد سماج کے لیے بھی اہم ہے فرد میں خواہشات جنم لیتی ہیں ہر فرد اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ان کی تکمیل کرتا ہے سماج میں ہر شخص میں صلاحیتیں ہوتی ہیں اور اپنے نظریات اور معیارات ہوتے ہیں جیسے ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد کی عادات اور رویئے ایک جیسے نہیں ہوتے یہی عادات ورویئے فرد کو دوسرے سے جدا کرتے ہیں اور یہی تنوع معاشرے اور سماج کا حسن ہے۔

معاشرے کا وجود انسانی وجود سے ہے اور یہ انسانی روئے ہیں ہیں جو مل کر سماجی رویے بنتے ہیں روئے منفی اور مثبت اس وقت ہوتے ہیں اور یہ سماج کی ذمہ داری ہے کہ منفی رویوں کو کنٹرول اور مثبت رویوں

کو بڑھاوا دے اس طرح معاشرے میں انصاف قائم رکھا جاسکتا ہے اور انصاف ہی معاشرے میں سماجی استحکام پیدا کرتا ہے۔

سماج افراد کے ملنے سے وجود پاتا ہے اور اس میں افراد کی ضروریات پوری ہوتی ہے سماج میں تنظیم قائم رکھنے کے لیے افراد پر شرائط و حدود کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ ایک سماج میں بہت سے چھوٹے بڑے گروہ ہوتے ہیں یہ تمام گروہ وہ بہت اہمیت رکھتے ہیں ہیں اور یہ گروہ مل کر افراد کی زندگی آسان اور سماج میں میں ربط قائم کرتے اور قانون سازی کرتے ہیں ہیں ہر گروہ کے اپنے مفادات ہوتے ہیں سماج میں افراد کے ایک دوسرے سے بھی مفادات جڑے ہوتے ہیں۔

کارل مارکس نے اس بارے میں کہا ہے:

> "انسان صرف ایک سماجی حیوان ہی نہی بلکہ ایسا جاندار ہے جو سماج میں رہتے ہوئے اپنی انفرادیت کی تکمیل کرتا ہے۔" (۶)

انسان کی فطرت میں سماج میں رہنا شامل ہے اسی لیے وہ سماجی زندگی گزارنے پر مجبور ہے ہے قرآن کریم کی آیتوں سے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے ہے کہ انسان کے اجتماعی ہونے کو اس کی کی بنیادی خلقت میں رکھ دیا گیا ہے۔

سورہ حجرات کی آیت نمبر ۱۳ ارشاد ہوتا ہے

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْاؕ-اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْؕ ﴾

ترجمہ:

> "اے لوگو ہم نے تمہاری تخلیق مرد اور عورت کے ذریعے کی اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا تاکہ تمہارے درمیان شناخت کی راہ نکل آئے نہ یہ کہ تم اس کے ذریعے فخر و مباہات کرنے لگو۔ بیشک اللہ کے نزدیک وہی زیادہ محترم ہے جو تم میں سب سے زیادہ صاحب تقوٰی ہے۔" (۷)

سماج فرد کی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے اور افراد ایک دوسرے سے تعاون اور ضرورت سے جڑے رشتے بناتے ہیں یوں تو جانور بھی سماجی زندگی گزارتے ہیں لیکن انسان کی سماجی زندگی ان سے بالکل مختلف ہے جیسے شہد کی مکھیاں دیمک اور چیونٹیاں بھی منظم زندگی جیتی ہیں لیکن برسہابرس کے گزرنے کے بعد بھی ان

میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس کے مقابلے میں انسانی سماج وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہا لیکن جانوروں کے سماج کا دارومدار ان کی جبلتوں پر ہوتا ہے لیکن انسان اپنے گروہ اور سماج میں عقل و شعور کی روشنی میں گزارتا ہے اور اپنی ضروریات یا تکالیف اور آرام کو دیکھتے ہوئے ان میں تبدیلیاں بھی کرتا ہے اور یوں سماج بھلے آہستہ ہی سہی تبدیل ہوتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ قدیم سماج میں بسنے والوں کی کی زندگیاں آج کے سماج میں بسنے والے انسانوں کی زندگیوں سے مختلف ہیں قدیم سماج میں انسان بہت مشکل حالات میں میں زندگی گزارتا تھا جبکہ آج کا انسان اپنی زندگیوں کو اپنی عقل و شعور کی روشنی میں آرام دہ بنا چکا ہے ہے اور اس کو کو وہ آسائشیں میسر ہیں جن کا قدیم سماج میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اس سماج میں رہنے کے لیے انسان کی حیوانی ضرورت ہوتی ہے جن کو ثقافتی ذرائع کے ذریعے حاصل کرتا ہے انسان کی بنیادی ضروریات میں پانی خوراک حرارت روشنی اور نیند شامل ہیں جن کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے ہے اس کے علاوہ جنسی تسکین اور تحفظ بھی ضروریات میں شامل ہیں انسان یہ سب سماج میں رہتے ہوئے مل جل کر پوری کرتا ہے اور اپنے لیے حفاظتی بندوبست کرتا ہے۔

"ہر انسان کے لئے اپنی حفاظتی ضروریات اتنی ہی اہم ہوتی ہیں جتنی کے جسمانی ضروریات"(۸)

انسان سماج میں رہتے ہوئے اپنی پہچان چاہتا ہے یعنی اپنی قابلیت اور صلاحیت کی بنا پر اپنی منفرد پہچان بناتا ہے تاکہ وہ انفرادی طور پر پہچانا جائے انسان کو اپنی تعریف سننا اچھا لگتا ہے اور وہ اپنی کامیابیوں کی تعریف چاہتا ہے وہ سماج میں رہتے ہوئے یہ خواہش کرتا ہے کہ سماج میں بسنے والے اس کی خوبیوں کی تعریف اور اس کے اچھے کام کو سراہیں اور سماج میں اس کی عزت اور توقیر ہو یہ انسان کی نفسیاتی ضرورت بھی ہے جب انسان کی تعریف ہو اور اس کو سراہا جائے تو وہ اور زیادہ محنت اور جدوجہد کرتا ہے اس کی بہتری کے لئے اور اپنی شخصیت کو نکھارنے اور پروان چڑھانے کے لئے۔

منظم سماجی زندگی

منظم سماجی زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ایسے جنسی تعلقات کے نظام کی فراہمی یعنی بچوں کی پیدائش سے سماج میں نئے افراد کی شمولیت کا سلسلہ جاری و ساری رہے یعنی ایسا بندوبست جس کے تحت نئی نسل پرانی نسلوں کی جگہ لے سماج کی بقا کے لیے انسانی جان کا تحفظ بہت ضروری ہے اندرونی و بیرونی جارحیت

کے مقابلے کے لئے مضبوط دفاعی نظام ہونا چاہیے سماج میں اتفاق رائے کا ہونا بہت ضروری ہے تا کہ مشترک نصب العین کو حاصل کرنے میں آسانی ہو۔

"ایک تنظیم کی حثیت میں سماج کا مشترک نصب العین ہونا چاہئے۔"(۹)

سماج میں عمدہ پیداواری نظام بہت ضروری ہے یعنی سماج کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وسائل و ذرائع بہتر انداز میں موجود ہوں اگر بہتر طور پر کام کر سکے گا کام کے دو پہلو ہوتے ہیں انفرادی پہلو، اجتماعی پہلو یعنی فرد اپنے کام کے ساتھ مشترکہ کاموں میں بھی حصہ لے بچہ اپنی پیدائش کے وقت صرف ایک حیاتیاتی جسم ہوتا ہے ہے اس کے سماجی وجود کی نشوونما خاندان اور برادری میں ہوتی ہے جہاں وہ شعوری یا غیر شعوری تربیت کے ذریعے سماج کے طور طریقوں سے آشنا ہوتا ہے اور سیکھتا ہے۔

ایک اچھے سماج کی یہ خوبی ہوتی ہے ہے کہ سماج میں موجود بچوں بزرگوں بیماروں اور اپاہجوں کی ضروریات کا خیال رکھا جائے اور ان کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کی جائے اور ان کی مشکلات کو دور کرنے کی کوششیں کی جائے اگر اس معاملے میں اعتدال نہ رکھا جائے تو سماج میں تناؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے جو معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنتی ہے اور ان تمام بے اعتدالیوں سے مزاحمت کی فضا پیدا ہو جاتی۔

سماجی تنظیم کے عناصر سماج میں چھوٹے اور بڑے کئی گروہ موجود ہوتے ہیں اور ان تمام گروہوں کی اپنی اہمیت ہوتی ہے کیونکہ یہ تمام گروہ مل کر سماج کی تنظیم کرتے اور فعال کردار ادا کرتے ہیں یہ گروہ افراد سے مل کر بنتے ہیں اور افراد کے ایک دوسرے پر مفادات مشترک ہوتے ہیں کئی دفعہ افراد گروہ دوسرے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں ہر گروہ میں داخلی نظام اور اپنائیت کا احساس موجود ہوتا ہے گھروں کا ایک رہنما یا سربراہ ہوتا ہے اور گروہ کے ارکان اس کے اصول وضوابط کا احترام اور پاسداری کرتے ہیں تا کہ انتشار سے بچا جا سکے آپس کا پیار و محبت قائم رہے اور ان, کی صلاحیتوں کو سراہا جا سکے۔

گروہ میں ہر فرد اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے اور اپنے رتبے کے لحاظ سے اپنے فرائض انجام دیتا ہے ایس سی دوبے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> "سماج میں ہر فرد کا رویہ طرز عمل اور جذبات اس کی حیثیت یا مرتبے کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ اور یہ بیک وقت انسان کے ایک سے زیادہ مرتبہ بھی ہو سکتے ہیں۔"(۱۰)

جیسے خاندان میں بیٹا یا بیٹی اور مدرسہ میں طالب علم اور سب کے ساتھ حیثیت بھی برابر نہیں ہوتیں بڑوں کے سامنے آپ کی حیثیت سے علیحدہ اور چھوٹوں کے سامنے علیحدہ ہوتی ہے۔

نظام فکر یا آئیڈیالوجی

یہ عقیدوں کا ایسا نظام ہے جس کے زریعے سماجی نظام کے اصول سمجھنے میں مدد ملتی ہے اس میں سماجی شعور اور نظام فکر کے مطابق لایحہ عمل تیار کیا جاسکتا ہے اس نظام کے تین اہم اجزا ہیں۔

ا۔ عالمی مشاہدات و نظریات

۲۔ اقدار

۳۔ معیارات

اس بارے میں شیاما چرن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> "عالمی مشاہدات و نظریات سے مراد سماج کا مجموعی شعور اور ادراک ہے جو وہ قدرتی سماجی ثقافتی روحانی مظاہر کی ماہیت مفہوم اور مقصد کے تعلق سے قائم کرتا ہے اقدار سے مراد وہ وہ نظریات و تصورات ہیں جو انسان اپنی دلپسند اور مرغوب چیزوں کے بارے میں قائم کرتا ہے اور معیارات وہ اصول ہوتے ہیں جن کے مطابق فرد اپنے افعال کو اپنے مرتبے حالات اور سماجی قدروں کی روشنی میں ڈھالتا ہے۔" (۱۱)

ہر سماج میں فرد کے اعمال کو جانچنے نے اور پرکھنے کے لیے ایک سربراہ حاکم مقرر ہوتا ہے جس کے پاس اختیارات ہوتے ہیں اقتدار کے ساتھ ہی محاسبہ کرنے کا اختیار بھی شامل ہوتا ہے تاکہ افراد کو قوانین کی پابندی کرائی جائے اور لڑائی جھگڑے کو ختم کرایا جائے اور امن کا قیام ممکن ہو سماج کو صحیح طور پر چلانے کے لئے علم و زبان اطلاع ترسیل تنظیمیں اور نظریاتی اجزاء ٹیکنالوجی مرتبہ حیثیت اور ذمہ داریوں اور نظام فکر اور اقتدار کی ضرورت ہوتی ہے۔

طبقاتی تقسیم

طبقاتی سماج دو بنیادی طبقات میں تقسیم ہوتا ہے ایک استحصالی طبقہ اور استحصال زدہ طبقہ ایک وہ جس کا احتصال ہوتا ہے اور دوسرا جو استحصال کرتا ہے یعنی ایک طبقہ ذرائع پیداوار پر قابض ہوتا ہے اور استحصال زدہ

طبقات محنت کش طبقہ ہوتا ہے اس کے اختیار میں زرعی پیداوار کی ملکیت نہیں ہوتی تاریخ کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے ابتدا سے سماج طبقات میں تقسیم نہیں تھا طبقات کا وجود پچھلے آٹھ دس ہزار سال کے درمیان ہی دکھائی دیتا ہے۔ قدیم سماج جہاں طبقاتی تقسیم نہیں تھی ایسے سماج کو قدیم اشتراکی سماج کہا جاتا ہے۔ قدیم سماج میں پیداوار کے ذرائع پسماندہ اور ابتدائی شکلوں میں موجود تھے تقریبا بارہ ہزار سال پہلے جانوروں کو پالنے اور ان کو سدھارنے اور کاشت کاری یعنی زراعت کا آغاز اور اس کی وجہ سے سماج میں معاشرتی تبدیلیاں رونما ایسا عمل کو Neolithic Revolution کہا جاتا ہے یہ تاریخ کا پہلا بڑا انقلاب مانا جاتا ہے۔ جانوروں کی مدد سے کاشتکاری کا فروغ ہوا نئے پیداواری رشتے بننا شروع ہوئے خانہ بدوشی کا خاتمہ ہوا نئی نئی بستیاں بننے لگیں اور پیداوار میں اضافہ ہونے لگا اس پیداواری اضافہ کی وجہ سے طبقاتی تقسیم شروع ہوئی اور یہ پیداواری اضافہ طبقاتی تقسیم کی بنیاد بنا۔ تاریخ کے مطالعہ سے طبقاتی سماج کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

غلام دارانہ سماج

اس سماج میں غلاموں کا استحصال کیا جاتا تھا۔ یہ جنگی اور قبائل پر کئے جانے والے حملوں میں قید کئے جانے والے افراد ہوتے تھے۔ غلاموں کو خریدنے اور بیچنے کا رواج عام تھا غلام اپنے مالک کی ملکیت ہوتے تھے اور ان کا استحصال عام تھا۔ قدیم روم اور یونان میں غلام دارانہ سماج کی مثالیں ملتی ہیں۔

جاگیر دارانہ سماج

غلام دارانہ نہ سماج کے بعد بعد تاریخ میں جاگیر دارانہ سماج کی مثالیں ملتی ہیں اس سماج میں جاگیر دار کی ملکیت میں زمین ہوتی تھی اور مزارع اور محنت کش افراد اس زمین پر کام کرتے تھے اور ان محنت کشوں کو معاوضہ بھی پورا نہیں ملتا تھا ان کی زندگیوں کا دارومدار جاگیر دار کے حکم پر ہوتا تھا اس سماج میں جاگیر داروں کے آتاہوں مزارعوں کا استحصال ہوتا تھا۔

سرمایہ دارانہ سماج

جاگیر دارانہ سماج کے بعد سرمایہ دارانہ سماج آیا اس سماج میں زرعی پیداوار حکمران طبقے کی ملکیت تصور کی جاتی تھی یعنی اس پر حکمران طبقہ قابض ہوتا تھا اور سماج میں بسنے والوں کی کثیر تعداد میں محنت اور مزدوری کرتی تھی اس قسم کے سماج کی شکل ہمیں زیادہ تر یورپی خطوں میں دکھائی دیتی ہیں مشرقی خطوں میں

یعنی ہندوستان چین اور فارس وغیرہ ہمیں اس سماج کی مختلف صورتیں دکھائی دیتی اس سماج میں زمین کسی بھی فرد کی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ اس کو تصرف میں لا سکتا تھا۔

کارل مارکس اپنی کتاب Grundrise میں لکھتے ہیں:

"ملکیت صرف اشتراکی ملکیت کے طور پر موجود ہے کوئی بھی فرد زمین کو محض کمیون کے ایک رکن کے طور پر بروئے کار لا سکتا ہے۔۔۔ ملکیت سماجی اور تصرف انفرادی ہے۔"(۱۲)

ظہور اسلام سے پہلے تمام دنیا کی بری حالت تھی سماجی ناہمواری موجود تھی جیسے عورت پر تشدد نسلی منافرت اور طبقاتی کشمکش اور عام انسان کی جان و مال اور عزت کی کوئی قدر نہ تھی یہود خود کو افضل ترین سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ وہ اللہ کی اولاد ہیں سپر پاور اور امپاور نے سماج کو تین حصوں میں منقسم کیا ہوا تھا امراء متوسط۔ نچلا۔ ایران خود کو عظیم اور تقدس والے سمجھتے تھے اور دوسری اقوام کو حقیر سمجھتے تھے ہندوستان کا سماج طبقات میں تقسیم تھا ان کے قانونی کتابچہ "منوشاستر" میں تحریر تھا۔

"برہمن برہما کے سر سے پیدا ہوئے تھے مذہبی پیشوائی اور رہبری ان کا فرض منصبی تھا پھر چھتریوں کا درجہ تھا جو برہما کے سینے سے پیدا ہوئے ان کے ذمہ لڑائی اور دفاع کا کام سپرد تھا تیسرے ویش طبقہ اس کا پیشہ زراعت و تجارت پھر شودر جو برہما کے پاوں سے پیدا ہوئے تھے ان کے زمہ تینوں طبقہ کی خدمت کرنا تھا۔"(۱۳)

عرب قبائل میں بھی تعصب کی فضا عام تھی اور ایک دوسرے کے رسم و رواج میں شریک نہیں ہوتے تھے معاشرہ طبقات میں تقسیم تھا ایک طبقہ صاحب حیثیت کا تھا دوسرا طبقہ کم حیثیت لوگوں کا تھا اور ان سے بیگار وصول کیا جاتا تھا عالم تاریکی کے اس ماحول میں ظہور اسلام سے روشنی کی کرن نمودار ہوئی اور یہ خبر سنائی دی کہ تمام انسان برابر ہیں اور اللہ کی مخلوق ہیں اور کوئی بھی حقیر پیدا نہیں ہوا قرآن پاک کی سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيرًا وَنِسَاء﴾

ترجمہ اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا
اور اس سے اس کی بیوی پیدا کی اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں
دنیا میں پھیلا دیں۔"(۱۴)

تمام انسان برابر ہیں اور کوئی اونچ نیچ نہیں ہے عربی ہندی گورے کالے مغربی و مشرقی سب کے حقوق برابر اور سب ایک جیسے انسان ہیں زبان وطن رنگ و نسل کی وجہ سے کوئی فرق نہیں ہے اگر بڑائی اور مرتبہ ہے تو اس کا معیار صرف تقویٰ ہے۔

سورت الحجرات میں ارشاد باری ہے:

ترجمہ: اے لوگو حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور عورت سے
پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے
تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکوں درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں
سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ زیادہ متقی ہو لیکن یقین رکھو
اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔"(۱۵)

اس آیت میں مساوات کا عظیم اصول بیان ہوا ہے کہ کسی کی عزت و شرافت کا معیار اس کی قوم قبیلے یا ملک نہیں بلکہ تقوی ہے سماج میں لوگوں کے مقاصد اور جدوجہد دوسرے لوگوں کے مقاصد اور کاوشوں سے ٹکراتے ہیں کیونکہ سماج میں مختلف قسم کے تضادات موجود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے تصادم ہوتا ہے اور اس تصادم کے نتیجے میں سماج طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

کارل مارکس نے اس بارے میں تحریر کیا ہے:

"تاریخ میں جتنے بھی سماج گزرے ہیں ان کی تاریخ طبقاتی جدوجہد سے
عبارت ہے۔"(۱۶)

طبقاتی تقسیم ہر سماج میں موجود رہی ہے اور اسی تقسیم کی وجہ سے لڑائیاں قتل و غارت ہوئے ہر طبقہ خود کو اہل اور عمدہ تصور کرتا ہے جبکہ دوسرے طبقے کی نظر میں حقیر ہوتے ہیں ہمارے معاشرے میں بہت سے روئے اور اصول ایسے رائج ہیں جو ملک میں طبقاتی تقسیم کو بڑھاوا دے رہے ہیں ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی اپنی بلند ترین سطح پر پہنچ چکی ہے۔ اور مہنگائی کی چکی میں پسنے والے عوام کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے اور عوام غریب سے غریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں معاشرے میں امیر اور غریب کے درمیان فاصلہ بڑھتا

جاتا ہے اور کسی بھی معاشرے میں اس کی کی ترقی کی کا دارو مدار اس کے متوسط طبقے پر ہوتا ہے اس بڑھتی ہوئی مہنگائی سے متوسط طبقہ سکڑتا جاتا ہے ان تمام معاملات کی باگ ڈور اس طبقہ کے ہاتھ میں جو مراعات یافتہ ہے اور ان حالات کی ذمہ دار بھی وہی مراعات یافتہ طبقہ ہے کیونکہ باقی طبقے تو انہی کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں ہمارے معاشرے میں رائج بہت سے اصول عادات رویئے ملک میں طبقاتی تقسیم کو بڑھانے کا سبب ہیں جیسے سالگرہ ہو شادی ہو یا کوئی اور تقریب ان پر لاکھوں روپیہ تو صرف سجاوٹ اور تزئین پر خرچ کر دیا جاتا ہے اور شادی کے فنکشن کئی روز تک چلتے رہتے ہیں اور ڈیزائنر سوٹ اور مہنگے زیورات کو بہت اہمیت حاصل ہے ان تمام لوازمات پر لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں یہ سب کام مراعات یافتہ طبقہ کے شوق ہیں ان لوگوں کی وجہ سے نکاح اور رخصتی مشکل ہو گئی ہے اور غریب گھروں کی بیٹیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے گھر بیٹھی رہ جاتی ہیں اور دھوم دھام سے شادی کرنے کا شوق ان کے دل میں حسرت بن کر رہ جاتا ہے روپے پیسے کا دکھاوا اور مقابلہ بازی اور شان و شوکت کو دکھانا معاشرے میں موجود دوسرے طبقات میں احساس محرومی اور عدم برداشت پیدا کرتا ہے جو آگے چل کر بہت سے نفسیاتی مسائل کا سبب بنتے ہیں اور یہ سب کچھ معاشرے میں موجود نچلے طبقے کی مشکلات میں اضافہ کرتا ہے۔

معاشی نظام

انسان فطرتاً اکیلا نہیں رہ سکتا زندگی گزارنے کے لیے اسے دوسروں کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے وہ گروہ یا معاشرہ تشکیل دیتا ہے انسان کو معاشرے میں رہنے کے لئے روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور معاشرے میں روپے پیسے کی لین دین اور دولت کے برابر تقسیم بہت ضروی ہے تاکہ معاشرے کا نظام عمدگی سے چل سکے۔

شاہد شاہنواز اپنے مضمون میں دولت کی تقسیم کے بارے میں کہتے ہیں:

> "دولت کی مساوی تقسیم سے مراد معیشت کا ایسی پالیسیوں پر عمل کرنا ہے جن کے تحت عوام کی مشکلات معاشی معاملات بیروزگاری اور مہنگائی سمیت دیگر مسائل پر پایا جاسے۔"(۱۷)

معاشرے میں دولت کی برابر تقسیم سے معاشرے کے بہت سے مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے معاشی ناہمواری معاشرے میں بے روزگاری غربت اور بہت سے دوسرے مسائل کو جنم دیتی ہے سرمایہ دارانہ

معاشرے میں وسائل طبقہ اشرافیہ کی ملکیت ہوتے ہیں اور اس وجہ سے دولت کا جھکاؤ بھی ان کی جانب ہوتا ہے اور یہ اپنے وسائل کو سرمایہ داری میں لگا کر اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں اور غریب غریب تر اور یہ امیر تر ہوتے جاتے ہیں اور یہ تاجر اور جاگیر دار حضرات دولت کی وجہ سے ریاستی اقتدار میں حصہ دار بن جاتے ہیں اور اپنی دولت کو مزید بڑھا لیتے ہیں اور کارخانوں کے مزدور اور مزارع اجرت پر کام کرتے ہیں اور ان کی حالت ابتر ہوتی جاتی ہے معیشت میں عدم استحکام اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہے اور ایسی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے دولت نچلے طبقے تک نہیں پہنچ پاتی اور یہ طبقہ مہنگائی بے روزگاری بھوک سے احساس محرومی کا شکار ہو کر انتہا پسندی اور بہت سی معاشرتی برائیوں کا سبب بنتا ہے۔

کرل مارکس کے خیال میں:

> "معاشی حالات اور انسان کی ابتدائی ضروریات میں قریبی اور باہمی تعلقات ہیں اس کے لئے ہمیں غذا کی کثرت اور فراہمی کو مد نظر رکھنا ہو گا اور معاشرے کو اسطرح منظم کرنا ہو گا کہ معاشرے میں سب کو معاشی تحفظ حاصل ہو اگر معاشرہ معاشی طور پر محفوظ اور ٹھوس ہو تو اجتماعی طور پر اتحاد اور تعاون میں اضافہ ہو گا۔"(۱۸)

اگر معاشرے میں سب معاشی طور پر محفوظ ہوں تو اس سے ملک کی ترقی میں مدد ملتی ہے کسی بھی ملک میں دولت کی پیداوار کا انحصار اپنے معاشی طریقوں پر ہوتا ہے دولت کو بڑھانے کے لئے علم اور تجربے سے معاشی طریقوں میں تبدیلیاں کی جاسکتی ہیں لیکن اگر یہ تبدیلیاں باہر کی دنیا کے تقاضوں کے برابر نہ ہوں تو معیشت پیچھے رہ جاتی ہے اور اس کا اثر ملک میں بسنے والے لوگوں پر ہوتا ہے معاشی تبدیلیاں آسان نہیں ہوتیں اس کے بہت سے سماجی سیاسی اور نظریاتی مضمرات ہوتے ہیں افراد کے معیار کا تعلق ان کی صلاحیت اور کوششوں پر ہوتا ہے ہندوستان کی معیشت گزشتہ دو سو سال سے برطانوی حکومت میں استحصال کا شکار رہی انگلستان کے کارخانوں میں اس ملک کا خام مال استعمال ہوتا تھا اور اس کے نتیجہ میں ایشیائی ممالک مغربی سامراج کی وجہ سے مفلس سے مفلس تر ہوتے گئے اور معیشتیں تباہ ہو گئیں اور ملک کی آبادی مفلس ہوتی چلی گئی آزادی کے بعد ان کے بگڑے ہوئے حالات کو سدھارنے میں بہت دشواریاں ہویں کسی بھی ملک و قوم کی ترقی میں معاشی نظام بہت اہمیت کا حامل ہے ملک کی ترقی میں معاشی نظام کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہوتی ہے۔ مفکرین نے معاشی نظام کو ایسے بیان کیا ہے۔

"معاشی نظام پیدائش دولت، تقسیم وتبادلہ دولت اور اشیاء و خدمات کے
صرف میں مصروف افراد کے منظم ربط باہمی کا نام ہے۔"(۱۹)

ملکوں کی ترقی کا راز مضبوط معاشی نظام پر ہوتا ہے ابتدا سے آج تک دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف معاشی نظام رہے ہیں ان معاشی نظاموں میں تین بہت مشہور ہیں ا سرمایہ دارانہ معاشی نظام ۲ اقتصادی معاشی نظام ۳ملا جلا اقتصادی نظام یہ تینوں معاشی نظام آج تک دنیا کے کئی ممالک میں موجود ہے امریکہ میں سرمایہ دارانہ نظام کی جھلک نظر آتی ہے روس اور چین میں اشتراکی نظام کی صورتیں موجود ہیں اور اسی طرح کا ملا جلا ایک نظام پاکستان میں بھی موجود ہے ان معاشی نظاموں کے فوائد کے ساتھ نقصانات بھی ہیں جن کی وجہ سے انسان ایک ایسے نظام کی تلاش میں جہاں سرمایہ دارانہ نظام کی طرح مزدوروں کا استحصال نہ ہو اور نہ اس طرح کی معاشی نظام کی طرح سیاسی آزادی کا خاتمہ نہ ہو اور نہ ہی ان کو فروغ ملے اس معاشی نظام کی طرح۔

سرمایہ دارانہ معاشی نظام

سرمایہ دارانہ معاشی نظام ایک مخصوص فکر و عمل کا نام ہے اس میں سرمایہ دار اپنے سرمائے کو ذاتی قابلیت اور کاوشوں کا نتیجہ تصور کرتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ دولت میں معاشرے کے دوسرے افراد کا عمل دخل بھی رہا ہے اس معاشی نظام پر مختلف مذاہب کی جانب سے اعتراضات بھی ہوئے اور اس نظام میں مادہ پرستی کا پہلو بھی موجود ہے اور معاشرہ سرمایہ دارانہ نظام میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے بے روزگاری اور معاشی بحران کا سبب بنتا ہے۔

اشتراکی معاشی نظام

اس معاشی نظام میں زرائع پیداوار حکومت کے پاس ہوتے ہیں۔ رابرٹ نے پہلی بارSocialism کا لفظ استعمال کیا ان کا نظریہ تھا۔

"لوگ اس صورت میں فائدہ اٹھاسکتے ہیں اگر وہ آپس میں اجتمائی فلاح
وبہبود کے پہلوکو مد نظر رکھتے ہوئے خود صنعتی اور زرعی
Communities کو قائم کریں۔"(۲۰)

اشتراکی نظام معیشت کا بنیادی مقصد محنت کشوں کے حقوق کا تحفظ اور سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ تھا کارل مارکس کو اس طرح کی معاشی نظام کا بانی کہا جاتا ہے وہ مذہب کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ جانتا تھا اس طرح

کی معاشی نظام میں سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی طرح مادیت پرستی اور اس نظام میں بھی لوگ دو وقت کی روٹی کے لئے حکومت کے غلام بن جاتے ہیں۔

مخلوطی معاشی نظام

سرمایہ دارانہ معاشی نظام اور اشتراکی معاشی نظام کی تباہ کاریوں کو دیکھتے ہوئے مخلوط معاشی نظام وجود میں آیا ان دونوں نظاموں کے فوائد اور نقصانات کو دیکھتے ہوئے اس نظام کو سرکاری اور نجی نظام مل کر حکومت چلائیں گے اور اس نظام سے نہ تو شخصی آزادی کا خاتمہ ہو گا اور نہ ہی دولت چند ہاتھوں کی ملکیت ہو گی پاکستان میں مخلوط معاشی نظام موجود ہے لیکن اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود یہ نظام بھی بد عنوانی کا سبب بن گیا ہے اسلامی معاشی نظام تینوں معاشی نظاموں سے کئی سورتوں میں مختلف ہے ان تینوں نظاموں میں مادی ضروریات کو انسان کی حقیقی ضروریات سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس اسلامی معاشی نظام میں شخصی آزادی ذاتی مفادات اور مذہبی اقدار کو مد نظر رکھا جاتا ہے اور دنیا کے درمیان اعتدال اہم ہے اس پر چلنے والا دنیا اور آخرت کی بھلائی پاتا ہے اور یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے ہمارے معاشرے میں موجود بد عنوانیوں ورشوت ستانیوں اور غربت کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی معاشی نظام کا فروغ ہو اسلامی معاشی نظام کو صحیح معنوں میں نافذ کیا جانا چاہیے تاکہ اس کے فوائد و ثمرات سے سماج کو فائدہ ہو اور ملک سے رشوت ستانی بد عنوانی اور بیروز گاری کا خاتمہ ہو جو کہ ہمارے معاشرے میں ناسور کی صورت اختیار یار کر چکے ہیں اور معاشرے میں غریب غریب تر ہوتا جارہا ہے غربت اور بیروز گاری کی وجہ سے معاشرے میں بہت سی برائیاں پیدا ہو گئی ہیں اس دولت کی نامناسب تقسیم نے غربت، بھوک، چور بازاری، ڈکیتی اور بہت سی سماجی مسائل پیدا ہو رہے ہیں غریب طبقہ اپنی کوششوں کے باوجود بھی مالی پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتا بے روز گاری بڑھ رہی ہے تعلیم یافتہ روز گار کے مواقع نہ ملنے پر نفسیاتی الجھنوں میں گھر رہے ہیں اور درمیانہ طبقہ بھی غریب کی فہرست میں شامل ہو چکا ہے یہ مہنگائی اور معاشی نظام کی تباہی کیجانب گامزن ہے اور یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ان تمام برائیوں سے بچا جائے معاشرے میں امن اور رواداری کا فروغ ہو۔

جب سماج کی تخلیق ہوئی رفتہ رفتہ سماج میں منظم ہوتا چلا گیا بستی اور شہر آباد ہونے سے نئے سماجی ادارے بننے لگے منظم سماجی زندگی کے لیے قوانین اور ثقافتی اقدار کی ضرورت محسوس ہوئی انسان کی

ضروریات بڑھنے کے ساتھ زبانوں کو فروغ حاصل ہوا آہستہ آہستہ انسان نے لکھنا سیکھا انسان کی زندگی میں میں کشادگی اور شعور آنے سے اس نے لکھنا شروع کیا اور ادب کی ابتدا ہوئی۔

"ادب بڑی حد تک سماج کی پیداوار ہوتا ہے اور سماج کو متاثر کرتا ہے۔"(۲۱)

معاشرتی زندگی کی کہانیوں نے ادب میں جگہ بنائی ادب سماج کا آئینہ بن گیا ادب میں سماج میں بسنے والوں کی زندگیوں کا عکس دکھائی دینے لگا سماج میں بسنے والے حساس لوگ اپنے گرد گرد ہونے والے واقعات و مسائل کا اثر لیتے اور جب یہ حساس لوگ ان مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں تو ادیب کہلاتے ہیں ادیب معاشرے کا حساس طبقہ ہوتا ہے وہ زمانے کے اثرات کا اثر عام لوگوں سے زیادہ لیتے ہیں ان واقعات و حقائق کو اپنے الفاظ کا پیرہن عطا کرتا ہے ہیں اور اس طرح ادب سماج اور ادیب کے درمیان ایک تعلق پیدا ہوتا ہے اور یہ رشتہ بنتا ہے ادب سماج میں تخلیق ہوتا اور سماج کے لوگوں کو متاثر کرتا ہے ادیب سماج کی حقیقتوں سے اثر لیتا ہے۔ سماج میں بسنے والوں کی زندگی کے حقائق سے کہانیاں چنتا اور تخلیق کرتا ہے یہ کام بہت ذمہ داری سے کرتا ہے یعنی حقائق اور سماجی زندگی کو ذمہ داری سے ادب میں جگہ دیتے ادیب اپنے زمانے کی تاریخ لکھ رہا ہوتا ہے۔ رسجندر نسر تھ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

"ادب سماج اور ادیب کی فکری صلاحیتوں میں بڑا گہرا تعلق ہے۔"(۲۲)

ادیب جب اپنے زمانے کے واقعات قلم بند کرتا ہے تو یہ ادب میں محفوظ ہو جاتے ہیں ادیب وہی کچھ تحریر کرتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے ادیب معاشرے کا احساس طبقہ ہوتا ہے ادب کا رشتہ سماج سے ہوتا ہے ادیب اس سماج میں رہتا ہے اور سماج اور ادیب کا باہمی رشتہ بنتا ہے ادیب جو کچھ اپنے ارد گرد مشاہدہ کرتا ہے اور سماج میں بسنے والوں کے مسائل دیکھتا ہے ان کے درد کو محسوس کرتا ہے اور اپنی کہانیوں میں جگہ دیتا ہے جب قاری ان کو پڑھتا ہے تو وہ اس درد کو محسوس کرتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

"ادب معاشرے کی روح کا ترجمان ہوتا ہے۔"(۲۳)

شہناز شورو ایک حساس طبیعت افسانہ نگار ہیں ان کا تعلق اندرون سندھ سے ہے ان کا اس علاقے پر مشاہدہ براہ راست ہے انہوں نے اپنی کہانیوں میں سماج کی برائیوں سے پردہ اٹھایا ہے ان کی کہانیوں میں معاشرے کا وہ چہرہ دکھائی دیتا ہے جس کو سب اچھا ہے کی چادر اوڑھا کر چھپا دیا جاتا ہے ان کے دو افسانوی مجموعے "لوگ لفظ اور آنا" زوال دکھ "ہیں ہر مجموعے میں سترہ افسانے ہیں ان کی کہانیوں میں سندھ کے وڈیرہ

شاہی اور جاگیر دارانہ نظام کے بھیانک روپ سے پردہ اٹھانے کی کوشش ہے ان کی کہانیاں ان کے علاقوں میں بسنے والوں کی حالت وذہنی پسماندگی اور جاہلیت کی روداد پر مزاحمت کرتی دکھائی دیتی ہیں انکی کہانیوں میں سماج کے دوغلے رویوں پر احتجاج کرتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر اسلم فرخی:

> "شہناز شورو کے افسانوں میں تلخی شدت پسندی واضع طور پر محسوس ہوتی ہے تلخی اور شدت پسندی کے خاردار سے گزرے بغیر زندگی کے حقائق کا صحیح ادراک نہی ہوتا۔"(۲۴)

ان کے افسانے سماجی مسائل کا عکس پیش کرتے ہیں ان کی کہانیوں میں طبقاتی سماج میں بسنے والوں کی زندگی کے مسائل کی وہ کہانیاں ہیں جو معاشرے کا ناسور ہیں وہ اس مٹی سے اپنا رشتہ نبھاتی دکھائی دیتی ہیں ان یہاں بسنے والوں کی خوشیاں اور غم ان کے ہیں ان کے مسائل کو بہت خوبی سے بیان کرتی ہیں وہ سب اچھا ہے کی منافقت قرار دیتی ہیں ان کے افسانوں میں معاشرے کے منافقانہ مزاج پر مزاحمت اور احتجاج موجود ہے۔

کشمکش

افسانہ کشمکش "لوگ لفظ اور انا" کا چھٹا افسانہ ہے اس افسانے کی کہانی ہمارے سماج میں پھیلے اور تضاد کی کہانی ہے جہاں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو رہا ہے۔ اس سماج کی کہانی ہے جہاں غریب کی بیٹی اپنی کٹیا میں کسی شہزادے آزادی کے خواب سجاتی ہے اس کہانی میں استحصالی نظام کا جبر عورتوں کے جذبات اور ان کی ذہنی کیفیت کا خوبصورتی سے بیان ہے۔ اس کہانی کا اہم کردار شائستہ ہے جس غریب گھرانے میں آنکھ کھولی یہ کل چار بہن بھائی ہیں۔ اس سے چھوٹی ایک بہن اور دو چھوٹے بھائی اس کی عمر بیس سال ہے اور ایف اے پاس ہے۔ شائستہ ایک خوبصورت لڑکی ہیں اس کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ ایک غریب لڑکی ہے۔

اس کہانی میں شائستہ اس بات کا ان الفاظ میں اظہار کرتی ہے:

> " یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ مٹی کے گھروں میں حسن پایا جاتا ہے۔ ہاں ہوتا ضرور ہے مگر پروان نہیں چڑھ سکتا۔ غربت کی بدصورت سیاہ زبان حسن کو چاٹ کر کوئلہ بنا دیتی ہے بہت قلیل مدت میں حسن کو کملا جاتا ہے۔"(۲۵)

شائستہ شادی کے سپنے سجائے بیس سال کی عمر میں ساٹھ سالہ جاگیر دار سے شادی کر لیتی ہے۔ شائستہ اس بارے میں خود بتاتی ہے:

"ہاں میں نے Blank Cheque کے عوض خود کو فروحت کر دیا ہے۔ مجھے کسی صاحب شروت شخص نے سادہ کپڑوں میں کالج میں دیکھا اور پھر میرے حسن اور اپنی دولت کو ترازو کے پلڑوں برابر تول کر کے کہنے لگا بس یا اور۔۔۔ میں نے بس کہہ دیا۔" (۲۶)

شادی کے بعد شائستہ کو دولت تو بہت میسر آئی لیکن وہ سچی خوشی نہیں پائی جس کی وہ طلبگار تھی۔ لیکن یہ سودا اس نے خود کیا تھا یسے کے لیے اس کہانی کا ایک کردار شائستہ کا جاگیر دار شوہر ہے اس کا نام سید سلطان سعید شاہ ہیں۔ وہ ایک عیاش شخص ہے اس کے ہاں دولت کی فراوانی ہے لیکن اس کے نزدیک عورت کی کوئی اہمیت نہیں اس بات کا احساس شائستہ کو شادی کے فوراًبعد ہی ہو گیا وہ لکھتی ہے۔

"جب میری شادی ہوئی تو مجھے پہلی بار حکم ملا تھا کہ مجھے اس کاغذ پر دستخط کرنے ہونگے جس کے تحت میرا شوہر اپنی مرضی کے مطابق ہر قدم اٹھا سکتا ہے۔ اور اگر مجھے اس کے فعل پر اعتراض ہے تو میں علیٰحدہ ہو سکتی ہوں۔" (۲۷)

یہ کہانی ہمارے معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کی جانب قاری کو متوجہ کرتی ہے دولت کے زور پر سب کچھ ہوتا ہے۔ شائستہ کی دو بیٹیاں ہیں نمی اور بے بی اور آگے چل کر شائستہ کو یہ احساس ہونے لگتا ہے اس کے گھر میں اس کے احساسات اور جذبات کی قدر نہیں ہاں ہر آسائش ہے۔

"میں Puppet ہوں تمہاری، میر ڈوریں تمہارے شاطر ہاتھوں میں ہیں میری سانسیں اپنی ہیں تمہارے پاس، میری خوشیوں پر تم نے اپنی دولت کے پہرے بٹار کھے ہیں۔ میں رہائی چاہتی ہوں اس پنجرے سے جس میں قید ہوں میں آزاد ہوا کے لیے ترس گئی ہوں عمر کو برتنا چاہتی ہوں۔" (۲۸)

ڈاکٹر فہیم اعظمی اس کے بارے میں کہتے ہیں:

"شہناز شورو نے بڑی خوبی سے استحصال نظام عورتوں کے جذبات کے جبر اور کرداروں کے عمل اور ذہنی کیفیت کی ترجمانی کی ہے۔" (۲۹)

سلطان شاہ کے گرد عورتوں کا ہجوم رہتا ہے اور روز ایک نئی عورت خواب گاہ میں موجود ہوتی ہیں یہ شخص اپنی بیوی شائستہ کے جذبات و احساسات کا استحصال کرتا دکھائی دیتا ہے۔ شائستہ کی روح مجروح ہے وہ اس دنیا سے نکلنا چاہتی ہے کیونکہ اب اس کو اپنا ماضی خوبصورت لگتا ہے غربت تو تھی لیکن اس کے احساسات کی قدر تھی۔ وہ جب اپنے میاں سے اس بارے میں بات کرتی ہے تو وہ اس کو روکنے کی بجائے صاف کہتے ہیں کہ جاؤ اور بیٹیوں کو بھی ساتھ لے جاؤ کیونکہ میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔

کہانی میں سماج کا وہ رخ دکھایا ہے جہاں رشتوں اور جذبوں کی کوئی اہمیت نہیں سب کچھ پیسہ ہے۔ شائستہ اپنے بیٹیوں سے بات کرتی ہیں لیکن دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ جانے کے لیے انکار کر دیتی ہیں اور کہانی کا اختتام اس اقتباس پر ہوتا ہے جہاں بے بی اپنے ماں کو کہتی ہے۔

"ہم میں سے کوئی کسی کے ساتھ محبت نہیں کرتا۔ بکواس ہے سب کچھ، دولت ہے تو آپ کے بے شمار چاہنے والے ہیں۔ اور اگر آپ کے پاس پیسہ نہیں تو کچھ نہیں ہیں۔ خدا کے لئے ممی اپنی زندگی کو تباہ کریں ہماری نہیں۔"(۳۰)

اس افسانے میں کرداروں کی بے حسی اور خود غرضی صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ سرمائے کا لالچ بولنے پر بابندی آزادی کا احساس تک چھین لیتی ہے عالمی بیداری کے دور میں ہمارے ہاں ابھی تک جاگیر داری کی بسات بچھی ہے۔

صاحب جی

صاحب جی کی ایک ایسی کہانی جس میں سماج میں موجود تضاد کھایا گیا ہے۔ امیری اور غریبی کی وہ کہانی جو ہمیں اس تضاد کی ستم ظریفوں سے نقاب اُٹھا کر بھیانک حقیقت سے آشکارا کرتی ہے۔ شہناز شورو ایک حساس لکھاری ہیں ان کی کہانیوں میں ہمیں سماج میں پھیلے ہوئے دکھ بہت صاف دکھائی دیتے ہیں صاحب جی کی کہانی کے کرداروں میں تین اہم کردار ہیں۔ نسرین، باجی اور صاحب جی۔ نسرین ایک بہت غریب گھرانے کی بیٹی ہے جس نے جب سے آنکھ کھولی ہے غربت کو ہی دیکھا ہے وہ اور اس کی ماں گھروں میں کام کر کے گزر بسر کرتی ہیں۔ نسرین کی ماں کے الفاظ اس اقتباس میں بھوک کی کہانی بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

"ماں باپ کے گھر میں تھی دو وقت کی روٹی نہ ملی۔ تین کپڑوں میں شادی کروا کر گھر سے نکال دیا اور شوہر ملا بھی تو کیسا۔ چرسی، نشی۔۔۔۔ اس مروان اولاد

کو کیسے جتن کر کے پالا۔۔۔ ہمیشہ بدن پر پورا کپڑا رکھا اور کھانے کو بھی تین ٹائم
دیا۔۔۔ صبح جب گھر سے نکلتی تھی اور آٹھ آٹھ گھر بٹاتی تھی۔" (۳۱)

نسرین بھی ماں کے ساتھ گھروں میں کام کرتی ہے اور اس کے بھائی بری عادتوں میں پڑ کر جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔ اس غربت میں پلنے والوں سے جنہوں نے کی سکھ نہ دیکھا ہو ہم کیسے امید لگا سکتے ہیں کہ وہ سماج کے اچھے شہری بنیں۔ جو معاشرہ انہیں دیتا ہے وہ وہی اس معاشرے کو لوٹا دیتے ہیں۔ جب انسان نے اچھی قدریں وروایات کا تجربہ ہی نہیں کیا تو وہ آگے چل کر ان کو کیسے اپنا سکتا ہے۔ نسرین جس گھر میں کام کرتی ہے وہاں وہاں پیسے کی کمی نہیں ہے زندگی بہت آسودہ ہے ایک باجی اور صاحب جی اس گھر میں ہیں اور ایک انکی بچی جو یر یا زندگی کا ہر سکھ اس گھر میں موجود ہے وہاں باجی اور صاحب جی ایک دوسرے سے بات بھی تمیز سے کرتے ہیں۔ اپنی بچی سے بہت پیار کرتے ہیں یہ سب کچھ دیکھ کر نسرین کو اپنی کسمپرسی یاد آتی ہے جہاں اسے ان چیزوں کے علاوہ کوئی پیار بھی نہیں کرتا وہ کہتی ہے۔

"زندگی ہو تو ایسی ایک میری زندگی ہے اور ایک میری بہن کی زندگی جس کو
میاں صابن تک نہیں لا کر دیتا۔ سارے شادی کے کپڑے بھی اس کی ساس اور
نندوں نے بانٹ لیے آپس میں بالیا بیچ کر اپنی بیٹی کا علاج کرایا تھا اب اس کا
میاں کہتا ہے دوسری شادی کروں گا۔" (۳۲)

یہ کہانی ہمارے معاشرے کے دونوں رخوں سے آشنائی کراتی ہیں اور ایک غریب کا کرب جب وہ دوسرے کے پاس سب کچھ دیکھے تو کیا ہوتا ہے کا پتہ دیتی ہے معاشرے میں موجود ایک ایسا تضاد جس کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا اور ان کے دکھ کا مداوا کرنے کی بجائے ان کو ہی موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے یہ بھوک ان کو کس نے دی کیا یہ خدا کی مخلوق نہیں ہیں کیا ان کے ہم پر کچھ حقوق نہیں ہے۔

باؤلی

باولی کی کہانی دوغلے سماج کی کہانی ہے جہاں انسان کبھی طبقوں میں بٹ کر اور کبھی معاشی ناہمواری کی ستم ظریف کو کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ غربت زدہ باولی کی کہانی ہے جس کا کوئی گھر نہیں ہے وہ لوگوں کے گھر کام کر کے دو وقت کی روٹی کھاتی ہے اور چین سے سوتی ہے۔ لیکن یہ سماج اور دوغلے درندوں کا ہے جو کپڑے تو اجلے پہنتے ہیں لیکن کرتوت کالے ہیں جو دن کے اجالے میں متقی بن پر گھومتے ہیں اور ان کے کرتوت رات کی تاریکی میں سامنے آتے ہیں۔ اس سماج میں گھر میں بیٹی عورت محفوظ نہیں وہاں بے گھر "باؤلی" کیسے تحفظ پا سکتی

تھی۔ اس طرح ایک رات باولی اجڑتی ہے اور پھر اس کو پتہ چلتا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ باولی بہت خوش ہوتی ہے کہ چلو اللہ اسے بیٹا دے گا تو اس کو ڈاکٹر بناؤنگی اور اس کے ساتھ زندگی کے سپنے بننا شروع کرتی ہے لیکن جب اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو وہ اس کو قتل کر دیتی ہے۔

یہ طبقوں میں بٹے سماج کی کہانی ہے جہاں ایک طبقہ ظالم اور دوسرا مظلوم ایک حاکم اور دوسرا محکوم ہے اللہ کی بنائی ہی دھرتی کو پیسے والوں نے خرید کر اپنی مرضی کے اصول اپنائے ہوئے ہیں اور غریب انسان جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ نہ اُن کے سروں پر چھت ہے اور نہ کھانے کے لیے روٹی یہ ایک لمحہ فکریہ ہیں ہمارے حکمرانوں کو سوچنا ہو گا کہ اس ظالم سماج میں مظلوموں کا حق کیسے ادا ہو۔ ان کے لیے بہت کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس اقتباس سے باولی کے احساسات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جب آپ نے نوزائیدہ بچی کا گلا دبانے والی باولی کہتی ہے۔

"سارا شہر منہ کالا کرتا رہتا ادھر ادھر کونوں میں ڈال کے "(۳۳)

باولی کا یہ کہنا ہمارے معاشرے کی گندگی ہمارے منہ پر دے مرنے کے برابر ہے۔ شہناز شورو ہمیں ہمارے سماج کی دوغلی تصویر اور حقیقت دکھا کر ہمیں ہمارا چہرہ دکھائی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر نثار ترابی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

" شہناز شورو کی بیشتر کہانیوں کے کردار صورتحال کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں"۔(۳۴)

پناہ

اس افسانے میں مرد اور عورت کے روایتی تعلق کے خلاف مزاحمت کا بیان ہے۔ اس سماج کی کہانی ہے جہاں ہر مرد عورت کو حاصل کر لینے کے بعد خود کو جاگیر دار کی طرح حاکم بن جاتا ہے اور عورت کو ایک جانور سے بھی کم حیثیت سمجھتا ہے۔ ایک ایسی کہانی جہاں مرد عورت کو بحثیت انسان نہیں لیتا اور اس کو عورت کے جذبات احساسات اور نظریات کی کوئی فکر نہیں بس وہ اپنی مرضی اور پسند ناپسند اس پر مسلط کر کے خوش ہوتا ہے اور اس کو جب پا لیتا ہے تو فاتح کی طرح پیش آتا ہے گردن اکڑ جاتی ہے۔ اپنا ایک کنواری لڑکی اور ایک شادی شدہ مرد کی کہانی ہے۔ ایک ایسی محبت کی کہانی جس میں صرف دھوکہ ہے پہلے وہ صرف ایک آزاد وجود تھی یعنی اس کی پسند ناپسند اس کے جذبات و احساسات تھے لیکن جب وہ اس محبت میں گرفتار ہوتی ہے تو

یہ اپنا سب کچھ ہار بیٹھتی ہے یعنی اپنی آزادی اپنی زبان، اپنی سوچ اور ایک زندہ لاش کی مانند خود کو محسوس کرتی ہے عورت ذات کا اپنا کوئی حوالہ نہیں ہے اس کی پہچان مرد کے نام سے کی جاتی ہے۔ اس کہانی میں نسوانی کردار مرد سے مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

"اپنی انفرادیت کو مار ڈالو، مرد کا نام چپکالو۔۔۔ زبان بدلو، میری بولی بولو۔۔۔ میری اطاعت کرو، خدمت کرو، مجھے حکم محرومی نہیں چاہیے۔ سب شرطیں منظور ہیں وہ گھبرا اٹھی۔۔۔ میں Brain Washing کے لئے تیار ہوں۔ مجھے پڑھاؤ میں نے ذہن صاف کر لیا ہے۔ سلیٹ صاف ہے تمہاری ہدایات کے مطابق بولو لفظ بناؤ لکھو خیال ڈالو سب کچھ Feel کرو۔" (۳۵)

ایک اور اقتباس عورت کی بے بسی اور ذہنی کیفیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ عورت خود کو کتنا غیر محفوظ تصور کرتی ہے۔ ہم آئے دن خبروں میں حوا کی بیٹی کی تذلیل ہونے دیکھتے اور سنتے ہیں۔

" آدم نے چھپنے کی جگہ دریافت کر لی ہیں ہوا چاروں اطراف پھر پھر کے بھی کوئی اوٹ، کوئی کنارہ، کوئی جھاڑی، دریافت نہ کر پائیں ہے۔" (۳۶)

شہناز شورو کی کہانیوں کے نسوانی کردار معاشرے کے زندہ کردار ہیں۔ یہ کوئی ماروائی کہانیاں نہیں ہیں ان کرداروں سے ہم اپنی زندگی میں کہیں نہ کوئی واسطہ پڑتا ہے۔ اس اقتباس میں عورت خود کا موازنہ ایک پالتو جانور سے کرتی ہے اور کہتی ہے۔

" تم عورت اور دودھ دینے بھینس میں تمیز کر ہی نہیں سکتے۔ کیا فرق ہے تمہاری نظر میں ان دونوں چیزوں میں؟ دونوں قابل استعمال، گوشت ڈھلک جانے کے بعد بھینس کو تم لوگ ذبح خانے کے سپرد کر دیتے ہو اور عورت کو سرد خانے کے۔" (۳۷)

یہ کہانی عورت کے ذہنی جذبات اور جنسی استحصال کے گرد گھومتی ہے جس میں گھٹن اور جبر سے اس کے باطن میں ٹوٹ پھوٹ پیدا کرتے ہیں۔

نورین رزاق اپنے مضمون میں لکھتی ہے:

" شہناز شورو کی کہانیاں عورت کے جذباتی اور جنسی استحصال کے گرد گھومتی ہیں۔ حارجی جبر اور گھٹن کی وجہ سے عورت کے داخلی و باطنی شکست وریخت اور اس کے نتیجے میں مٹتے، گلتے، سڑتے احساسات وجذبات تعفن کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ اس کے سارے خواب اندر ہی اندر آسیب کی طرح پلتے اور دبائی گئی سسکیاں بگولوں کی مانند چکر لگاتی ہیں۔" (۳۸)

لااِکراہ فی الدین

ہمارے سماج کی کہانی ہے جو بہت سے طبقات میں تقسیم ہے انسانیت کے سوا تمام طبقے ومذاہب اہم ہیں مذاہب کے درمیان پھیلتی نفرت ہمارے سماج کا المیہ بن چکا ہے۔ یہ افسانہ بابری مسجد کے تنازعہ کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے لیکن یہ آج کے ہمارے معاشرے میں موجود مذہبی منافقت کا عکس دکھا رہا ہے۔ اس کہانی کا اہم کردار دین محمد ہے جو مسجد کا پیش امام بہت اچھے کردار کا مالک ہے تمام محلے کے مرد وعورت اس کی باتیں مانتیں ہیں دین کی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر چلنے کی کوشش کرتا ہے باکردار ہے مسجد کے تمام معاملات کو دیکھتا ہے محلے میں کوئی بھی مسئلہ ہو شادی ہو یا پھر علیحدگی یہ سب مسلے دین محمد کی دینی معلومات کی وجہ سے سلجھتے ہیں اور جدید آلات اور انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کا علم جانتا ہے۔ اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ جب بابری مسجد کا مسئلہ زور پکڑا گیا ہندو مسلم کے درمیان نفرت زیادہ پھیل گئی اور جب یہ انتقام زیادہ ہو گیا تو مسلمانوں میں بھی اسی طرح ہندوں کی دکانوں اور گھروں کو جلانے کی سازیشیں ہونے لگیں لیکن دین محمد کا کردار ان نفرتوں کو کیسے قابو کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ وقت کی ضرورت ہے۔

اس اقتباس میں دین محمد کا بیان دیکھیے:

"دیکھو بھائیو۔۔۔ کیا ہمارا مذہب یہ کہتا ہے کہ گناہ گار کی سزا بے گناہوں کو دیں بے قصور عورتیں اور بچے یتیم بنا دیئے جائیں۔"(۳۹)

دین محمد نفرتیں مٹانے کو کوشش کرتا ہے لیکن بکھرے جوان جوش کی بات کرتے ہیں ہوش سے کام نہیں لیتے لیکن دینِ محمد کی باتوں کو پسند نہیں کرتے اور بدلے کی آگ کو بھڑکانہ چاہتے ہیں دین محمد اپنی کوششیں کرتا رہتا ہے اور کبھی کہتا دکھائی دیتا ہے۔

"میں نے خود غیر مذہب کے ماننے والوں کے گھروں میں کہرام دیکھے ہیں ویسے ہی ماتم ہمارے گھروں میں ہوتے ہیں یہ شیطان کا جال ہے یہ انسانوں کے

لڑانے کی سازش ہے اسے ناکام کرو میری بہن بیوہ ہو گئی یا کسی عیسائی کے گھر
اولاد کا قتل ہو گا یا کوئی ہندو عورت چوڑیاں توڑ کر پاگل ہو گی سب انسان ہی ہیں
دکھ کی کوئی ذات نہیں ہوتی درد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہمارا مذہب رواداری
محبت اور امن کا مذہب ہے یہی ہمارے ہتھیار ہیں۔" (۴۰)

اس اقتباس سے دین محمد کے کردار کی سچائی ہے جو کہ معاشرے میں امن و سلامتی چاہتا ہے یہی امن و سلامتی ہمارے معاشرے کی ضرورت ہے آج ہم بہت سے طبقات میں بٹ چکے ہیں کہیں زبان کے نام پر جھگڑے ہیں کہیں قومیت کے نام پر اور کہیں مذہب کے نام پر معاشرے میں شدت پائی جاتی ہے۔ شہناز شورو اس کہانی میں ہمارے سماج میں موجود نفرتوں کے خلاف مزاحمت کرتی دکھائی دیتی ہیں ہمارے معاشرے کو دین محمد جیسے کرداروں کی ضرورت ہے۔ آگے کہانی میں دین محمد ہمسائے میں رہنے والے ہندو گھرانے کو کیسے تحفظ فراہم کرتا ہے اور اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ سماج اپنی صحت مند اقدار کھو رہا ہے ہمیں معاشرے میں اچھے اقدار کو فروغ دینا ہو گا اور شدت پسندی اور منافرت کا خاتمہ کرنا بہت ضروری ہے تاکہ ایک پُرامن معاشرہ کی تشکیل ہو سکے۔

عذرا اصغر کہتی ہیں:

" شہناز کا مشاہدہ بہت تیز اور گہرا ہے ان کی دور بین نگاہیں زندگی کے
اندھیرے غار میں پڑا وہ تمام گلدستہ، بدبودار کچرا دیکھ لیتی ہیں جو عمومی
نگاہوں کو دکھاتا ہی نہیں۔" (۴۱)

آخری آدمی

شہناز شورو کے افسانوں میں مشاہدے کی گہرائی وسعت فکر اور زندگی کا بغور مطالعہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتی ہیں اس کو بے جھجک انداز میں بیان کرتی ہیں اور ان کے افسانوں میں تلخی اور شدت پسندی کو محسوس کیا جا سکتا ہے انہوں نے اپنے عہد کی تلخیوں کو محسوس کیا اور انہیں اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا شہناز کی کہانیوں کے کردار ایسے معاشرے اور ماحول کے کردار ہیں۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

" یعنی یہ کہ بہت سی کہانیوں کے واقعات اور کردار وہی ہوتے ہیں جو سینکڑوں
سال پہلے لکھی ہوئی کہانیوں میں تھے مگر تخلیق کار انہیں کس طرح اپنے عصر

سے ہم آہنگ کرتا ہے اور انہیں کس طرح اپنے دور کے زندہ کرداروں اور
زندہ معاشرے کی کہانی بنا دیتا ہے اور شہناز شورو کی کہانیوں کی یہی سب سے
بڑی خوبی ہیں۔"(۴۲)

شہناز شورو کے افسانے " آخری آدمی" یہ کہانی مجموعہ لوگ لفظ اور انا میں شامل ہیں۔ اس کہانی میں معاشی نظام کی ناہمواری کو موضوع بنایا ہے اور عزت کی کہانی کو بہت تلخ انداز میں پیش کیا ہے اور اس میں معاشرے کی بے حسی پر مزاحمت صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر یہ احساس بہت شدت سے ہوتا ہے کہ بھوک ہر جذبے پر بھاری ہے۔ یعنی اگر بھوک حد سے بڑھ جائے تو اس کے سامنے کسی بھی جذبے کا احساس باقی نہیں رہتا چاہے وہ محبت ہو یا حسن، بھوک ہر احساس پر حاوی دکھائی دیتی ہیں۔

آخری آدمی اسی معاشرے کی ایک تلخ حقیقت ہے اس کہانی کے تین کردار ہیں۔ ماں، باپ اور بچہ ایک کہانی اور غربت کی تلخ حقیقتوں کا کرب لیے ہوئے ہے۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے اس درد کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو بچہ اس غربت سے لڑتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔

بھوک کا احساس تمام رشتے بھلا دیتا ہے اس کا اقتباس دیکھتے:

" دنیا میں صرف ایک ہی کشش ہے اور وہ ہے بھوک کی کشش، انسان اس
کشش کے سحر میں سب کچھ بھول جاتا ہے اور اگر زندگی کی ابتدا سے لے کر
یہی کشش انتہا تک پیچھا کرے تو بقیہ تمام احساس مر جاتے ہیں بھوک کی کرشمہ
سازیوں میں ہر رشتہ غیر اہم ہو جاتا ہے۔"(۴۳)

اس کہانی کو پڑھتے ہوئے اس بچے کے دکھ کا اندازہ ہوتا ہے جس کو بھوک کی وجہ سے ماں بھی چھوڑ جاتی ہے اور وہ ماں کے بغیر اس معاشرے کی تلخیاں کیسے سہتا ہے اور باپ اس کو کیسے پالتا ہے۔ وہ لوگ جن کو اس معاشرے میں سب کچھ میسر ہے وہ غریب کی بھوک کے درد کو کبھی محسوس نہیں کر سکتے لیکن شہناز شورو نے اس کہانی کے دکھ کو تحریر کیا ہے اور قاری کو پڑھتے ہوئے اس تمام کرب کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کہانی میں معاشرے کا جبر نمایاں ہے اور یہ کہانی معاشرے کی ناانصافیوں کے خلاف مزاحمت لیے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کہتے ہیں:

"شہناز شورو کے افسانوں میں تلخی اور شدت پسندی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ خیال ہے کہ تلخی اور شدت پسندی کے خارزار سے گزرے بغیر زندگی کے حقائق کا صحیح ادراک اور عرفان حاصل نہیں ہوتا۔" (۴۴)

اقتباس دیکھتے:

"ایک طرف فُٹ پاتھ اور ان کے اطراف کیڑوں کی طرح پلنے والی زندگیاں اور دوسری جانب کلف زدہ گردنوں والے اکڑے ہوئے چمچماتی گاڑیوں میں سوار اجنبی چہرے۔" (۴۵)

اس اقتباس میں معاشرے میں موجود معاشی ناہمواری کی تصویر نمایاں ہے جس میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جارہا اور اسی ناہمواری کی وجہ سے لوگ خودکشیاں کر رہے ہیں۔ اس کہانی کے کردار نے بھوک کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے اور اس کی ماں جو بھوک کی وجہ سے گھر اور بچہ چھوڑ جاتی ہے اس کی بھوک کا کرب اس اقتباس میں پوشیدہ ہے۔

"تمہاری ماں کہاں ہے؟ پتہ نہیں؟... کیوں؟ میں نے اسے نہیں دیکھا مر گئی!!! نہیں بھاگ گئی مجھے اس جنگل میں پھینک کر کہیں دور چلی گئی... بابا کہتا تھا... جب اسے روٹی نہیں ملتی تھی تو وہ چیخ چیخ کر روتی تھی۔" (۴۶)

اس معاشرے میں موجود معاشی ناہمواری کے خلاف شدید احتجاج نظر آتا ہے کیسے خدا کی مخلوق اس بھوک کا شکار ہے۔

رانی باجی

رانی باجی کی کہانی غربت اور معاشرتی برائیوں کی کہانی ہیں۔ کیسے غربت اپنے پنجے گاڑتی ہے تو اچھائی اور برائی کا فرق مٹ جاتا ہے۔ پیٹ کے آگ کو بجھانے کے لیے انسان برائیوں کی دلدل میں پھنس جاتا ہے اور اپنی قدریں بھول جاتا ہے۔ یہ کہانی رانی کی کہانی اس کے آٹھ بہن بھائی ہیں گھر میں غربت ہے دو چھوٹے بچے سکول جاتے ہیں اور بڑے چار بچے کچھ نہ کچھ کمانے لگے تھے اور رانی تمام دن حاموشی سے گھر کے سارے کام کرتی۔

اس اقتباس میں گھر کے ماحول کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

" نثار سے فروٹ، سلیم سے پیسے اور جمیل سے سنیما کے ٹکٹ منگوایا کرتے دونوں چھوٹے سکول جاتے اور ان سے بڑی دو بہنیں سرمہ، کاجل آنکھوں میں بھرے چٹک مٹک کرنے کی پوری کوشش کرتیں اماں کو خاطر میں نہ لاتیں کہ اَباِاِن کی آڑ میں کئی بار اماں کو دھنک چکے تھے گھر کے تمام افراد اپنی اپنی محرومیوں کی کسر رانی باجی کو تنگ کر کے نکالا کرتے۔" (۴۷)

اس اقتباس سے اس گھر کی حالت زار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کے گھر میں غربت اور جہالت کا دور دورہ تھا اور اخلاقی پستی کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جہاں ماں باپ کو بچوں کی تربیت اور ان کے اخلاق سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ماں باپ اپنی دھن میں زندگی جی رہے تھے اور بچے اپنے باپ کی سختی تھی اور ماں بھی بچوں سے نرم لہجے میں کبھی بات نہ کرتی تھی۔ پیسہ ہی تو سب کچھ سمجھا جاتا تھا اور وہ بھلے کیسے ہی کمایا جائے اس بات کی پرواہ نہ تھی اور ایسے ماحول میں جہاں اخلاقی قدریں ناپید ہوں وہاں اچھائی کی امید لگانا ایک بڑا دھوکا ہے۔

شہناز شورو ایک نڈر لکھاری ہیں اور ان کی نظر معاشرے میں پھیلی برائیوں کا پردہ چاک کرتی ہیں اور اس کی بھیانک تصویر اپنے قاری کو دکھاتی ہے اس کہانی میں رانی باجی اپنے ہی باپ کے ظلم و زیادتی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایک بیٹی اپنے گھر میں بھی محفوظ نہیں ہے ہم روزانہ آئے دن ایسے واقعات اخبارات میں پڑھتے ہیں یہ واقعات معاشرے کی بھیانک تصویر دکھاتے ہیں کہ جہاں عورت مر کر بھی محفوظ نہیں ہے اور نہ ہی اپنے گھر میں۔ لیکن ایسے لوگ خود برائی کریئں تو کچھ نہیں اگر بیٹی یا بہن کو کچھ کرے تو غیرت کے نام پر قتل بھی ہو جاتی ہے۔

اس اقتباس سے معاشرے میں موجود دوغلے پن کی جھلک کو دیکھا جاسکتا ہے۔

"ابّا غصے میں لال پیلے ہو رہے تھے سب سہمے کھڑے تھے کہ کب وہ چھری سے رانی باجی کا پیٹ چاک کرتے ہیں۔ مگر چند سیکنڈ میں ابا بالکل پیلے پڑ گئے کسی انجانے خوف سے اپنے کپڑوں پر پڑی گندگی اور دبھوں کے ساتھ وہ گھر سے باہر چلے گئے پھر کسی نے ابا کو نہیں دیکھا۔" (۴۸)

وقت کی امر بیل

یہ متوسط گھرانے کی کہانی ہے جو معاشی طور پر مستحکم ہونے کے لئے اپنی جوانی داؤ پر لگا دیتے ہیں یہ کہانی ہمارے معاشرے کی کہانی ہے ایسے کردار ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے ہیں۔ سماج میں معاشی ناہمواری کی وجہ سے غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اس معاشی ناہمواری کو جھیلتے ہوئے جب ایسے گھرانے کے بچے اپنی جوانی میں پہنچتے ہیں تو ایک سنہرے مستقبل کا خواب دیکھتے ہیں جہاں وہ معاشی طور پر مستحکم ہوں اور انہیں وہ سب نہ جھیلنا پڑے جو یہ بچپن سے اپنے ارد گرد دیکھتے آئے ہیں۔

ایک کہانی ایک ایسے جوڑے کی ہے جن کو جوانی میں پیار ہو جاتا ہے اور وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت پیار کرتے ہیں اور یہ پیار پا کر دونوں ہی بہت خوش ہوتے ہیں۔

> "لاابالی عمر گلوں جیسی باتیں خوابوں جیسی سوچیں کتنا حسن تھا زندگی میں جب ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے تو کئی چہرے ساعت گزر جاتے کتنی ہی بار خیالات اور نظریات سے ٹکراؤ سے ارتعاش سا پیدا ہوا۔۔۔ گھنٹوں فون پر کہانیاں سناتے۔۔۔ کیا پر نشاط زمانہ تھا۔ یہ دونوں اپنی دنیا میں مگن تھے اور دن عید اور رات شب رات تھی اور جب شادی کرنے کی بات آئی تو اسد کو مستقبل کی فکر ستانے لگی اور اس نے کہا اور جب خواہش کے ثمر ہونے کا وقت آیا تب تم نے خاصا انوکھا فیصلہ کیا میں بہت بڑا آدمی بننا چاہتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ اپنا کیریئر بناؤں ایک بہترین پر آسائش گھر، گاڑی، اعلیٰ اسٹیٹس، بینک بیلنس ان کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔" (۴۹)

یہ ہمارے سماج کا بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم اپنے ارد گرد پھیلی معاشی ناہمواری سے نظریں نہیں چرا سکتے اور غریب معاشرے میں امیر آدمی کی عزت و تکریم پیسے کی وجہ سے دیکھتا ہے تو وہ یہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چاہے اس کے بدلے میں اسے کوئی بھی قیمت ادا کرنا پڑے۔ وہ اس بارے میں کہتا ہے۔

> "ابھی سے شادی کر لئیں۔۔۔ اور پھر بچے۔۔۔ میں ایک کام کلرک۔۔۔ تم ایک عام گھریلو بیوی۔۔۔ حالات اور مسائل مہنگائی کا رونا روتے بیت جائے گی۔ لائٹ کا بل۔۔ پانی کا بل، گیس کا بل۔۔۔ یہ مسئلہ وہ مسئلہ۔۔۔ اف مائی گاڈ۔" (۵۰)

اس اقتباس سے اس کی محرومی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے وہ جیسے ماحول سے گزرا ہے اس کو وہ دوبارہ نہیں دہرانا چاہتا سماج میں غریب کی کو عزت نہیں اور اگر کوئی پیسے والا ہے تو کوئی اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ پیسہ کہاں سے آیا بس سب اس سے مرعوب ہوتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں اور ان جیسا بننا چاہتے ہیں دوسری جانب غریب کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں بنیادی ضرورتوں کے لیے روزانہ جیتا اور مرتا ہے یہ سب کچھ ہمارے ارد گرد ہو رہا ہے۔

کہانی میں یہ دونوں کردار مستقبل کے سہانے خواب سجائے آگے بڑھتے ہیں یہ دونوں زندگی میں آگے بڑھ کر وہ مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کے انھوں نے سپنے دیکھے تھے کہانی میں آگے چل کر اسد ملک سے باہر چلا جاتا ہے اور بہت پیسہ کماتا ہے اور اس کی محبوبہ بھی ایم اے کے بعد جاب کر لیتی ہے۔ پہلے پہل دونوں میں رابطہ رہتا ہے پھر رفتہ رفتہ یہ رابطہ منقطع ہو جاتا ہے دونوں زندگی کی دوڑ میں مگن ہو کر اپنی حقیقی خوشیوں کو بھول جاتے ہیں بہت عرصہ گزرنے کے بعد جب ان دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو دونوں وہ پہلے والے نہیں رہتے۔ جوانی اور اس کا کالا ابالی پن ختم ہو جاتا ہے ان دونوں کے پاس زندگی کی ہر آسائش تو آجاتی ہے لیکن حقیقی خوشی غائب ہو جاتی ہے اور ایسے میں وہ اسد کو مخاطب کر کے کہتی ہے۔

"اسد جب پیڑ پر ثمر پک جائے تو اسے وقت پر توڑ لینا بہتر ہوتا ہے۔ ورنہ
خزاں کی زرد آندھی امر بیل بن کر سب کچھ چاٹ جاتی ہے۔ (۵۱)

مراجعت

مراجعت رجع سے ہے یعنی واپس آنا یا رجوع کرنا ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس نے ایک گندے نالے کے قریب پستی میں آنکھ کھولی اور وہاں کی ہیبت ناکیوں کو برداشت کر کے جوان ہوا۔ یہ کہانی ہمیں سماج کے اس رخ سے پردہ اُٹھا کر اُس کے دکھ دکھاتی ہے جس کا ذکر بھی ہم کرنا نہیں چاہتے لیکن یہاں پر بھی زندگی صرف سانس لیتی ہے۔

"میں ٹین کے صندوق جیسے گھر میں پیدا ہوا تھا جو ہر طرف سے بجتا تھا۔
ہوا اسے بجاتی تھی بارش اسے بجاتی تھی۔۔۔ ہم بد تہذیب گندے بچے اس
سے نکلنے کی جدوجہد میں اس کے سارے اطراف ٹناٹن بجاتے رہتے تھے۔ ہم
گندے نالے والے لوگ کہلاتے تھے کیونکہ ہمارے صندوقچوں جیسے گھروں

کے آگے ایک بہت بڑا کھلا سیاہی مائل تالاب تھا بلکہ کبھی تالاب تھا اب
تو بدبو گھاٹ تھا۔"(۵۲)

اس افسانے میں سماج کے غربت میں پسے ہوئے لوگوں کا حال ہے کہ وہ کیسے اتنی گندگی کی جگہ اپنی زندگیاں گزارتے ہیں۔اُن کے احساسات اور جذبات سب بھوک سے جڑے ہوتے ہیں وہ کیا قدروں کی پاسداری کریں گے جن کا بچپن چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے ترستے گزرا ہو۔لیکن کہانی کا یہ کردار اچھی جگہ رہنے کا خواب دیکھتا ہے وہ سوچتا ہے کہ کسی ایسی جگہ جا کر رہا جائے جہاں بدبو نہ ہو۔اس اقتباس سے اس کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"ایسے میں۔۔۔کسی ادھ سوئی۔۔۔ادھ جگی سی رات میں ایک خواب
نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔یہ خواب زندگی بدلنے کو خواب تھا ایکا ایکی مجھ
پر انکشاف ہوا یہ بدبودار جگہ ہمارے نصیب میں لکھی ہے۔بلکہ یہ معاشرتی
تضاد کی وجہ سے ہمارے حصے میں آئی ہے ہمیں حالت بدلنی ہو گی ہم یہاں
سے دور کسی شفاف اور صاف جگہ پر زندگی بسر کر سکتے ہیں"۔ (۵۳)

یہ کہانی طبقات میں بٹے ہوئے سماج کا آئینہ ہے۔اس کہانی میں آگے چل کر یہ کردار زندگی میں ایسے مقام گویا پا لیتا ہے جہاں اس کو سب آسائشیں میسر ہیں۔اس کے پاس شہر کے بہترین علاقے میں بڑا سا گھر ہے بیوی ہے بچے ہیں۔یہ طبقوں میں نئے سماج کی کہانی ہے جہاں دو طبقے دو انتہاؤں پر ہیں۔

غریب غریب تر ہے اور جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہا ہے اور زندگی جی نہیں رہا بلکہ منسلک رہا ہے اور دوسری جانب وہ طبقہ جو پیسے کے زور پر زندگی کی تمام آسائشیں حاصل کرتا ہے زندگی اس کے گھر کی لونڈی ہے۔اس کہانی میں دو انتہائیں ہیں اور ہم اس مظلوم اور پسے ہوئے لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جسے یہ اُن کا گناہ ہو حالانکہ یہ سب دولت کی نامناسب تقسیم حصہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاھد حسین ڈار "ادب سماج اور کلچر wwwurduinks.com" ۱۱ جنوری ۲۰۱۰ء، 12:20am

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ عبد القادر عمادی، ڈاکٹر، "ابتدائی سماجیات"، ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی، ص ۵۹

۵۔ ایضاً، ص ۱۹

۶۔ شیاما چرن دوبے، "سماج سناشی"، نیشنل کونسل آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ نئی دہلی، ۱۹۷۸ء، ص ۲۷،

۷۔ شبیر مرتضیٰ مظہری، "سماج اور تاریخ"، سازمان تبلیغات اسلامی بین الملل، ۱۴۱۰ء، ص ۱۴

۸۔ شیاما چرن دوبے، "سماج شناسی"، نیشنل کونسل آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ نئی دہلی، ۱۹۷۸ء، ص ۲۸

۹۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۷

۱۱۔ ایضا، ص ۳۸

۱۲۔ لال خان، "طبقاتی سماجوں کی تاریخ"، wwwdunia.comPK ۷ جولائی ۲۰۱۸ء 12:50 am

۱۳۔ محمد قاسمی، "اسلام کا معاشرتی نظام"، www darululoom deoband جنوری ۲۰۱۷ء 10:10pm

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ لال خان "طبقاتی سماجوں کی تاریخ" wwwdunia.com.pk ۷ جولائی ۲۰۱۸ء، ص ۲۵ 12:30pm

۱۷۔ شاھد شاھنواز deli www mmnews.tv 3rd دسمبر ۲۰۲۱ء 02:10am

۱۸۔ کنور محمد اشرف "ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں" نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی، ۱۹۷۴ء، ص ۱۸۸

۱۹۔ عمارہ فاطمہ "مختلف معاشی نظاموں کے مسائل اور اُن کا حل https:/ daily Pakistan.com.pk" ۲۳ مئی ۲۰۱۴ء 11:10pm

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ ایضاً

۲۲۔ راجندر ناتھ شیدا "ادب سماج اور ادیب" ص ۷

۲۳۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر

۲۴۔اسلم فرخی،ڈاکٹر "سلسلہ"، سلسلہ پبلیکشنز گلشن اقبال کراچی، ص ۲۳

۲۵۔ شہناز شورو "کشمکش، لوگ لفظ اور انا"، مثال پبلشرز فیصل آباد ۲۰۱۸ء، ص ۶۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۵

۲۷۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۸۔ فہیم اعظمی، ڈاکٹر "شہناز شورو کے افسانے" مشمولہ سلسلہ، گلشن اقبال کراچی، اگست ۲۰۰۶ء، ص ۱۶

۲۹۔ کشمکش "لوگ لفظ اور انا"، ص ۶۴

۳۰۔ ایضاً، ص ۶۵

۳۱۔ صاحب جی "زوال دکھ"، ص ۸۲

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ باولی "زوال دکھ"، ص ۱۱۶

۳۴۔ نثار ترابی "زوال دکھ"، مشمولہ سلسلہ، گلشن اقبال کراچی، فروری ۲۰۱۸ء، ص ۴۳

۳۵۔ پناہ "لوگ لفظ اور انا"، ص ۴۵

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ نورین رزاق "شہناز شورو کے افسانوں میں نسائی احساس" مشمولہ، سلسلہ، گلشن اقبال کراچی، فروری ۲۰۱۸ء، ص ۲۶

۳۹۔ لااِکراہ فی الدین "زوال دکھ"، ص ۱۰۰

۴۰۔ ایضاً

۴۱۔ عذرا اصغر "شہناز شورو اور اُن کے افسانے" سلسلہ، گلشن اقبال کراچی ۲۰۱۸ء، ص ۳۸

۴۲۔ آخری آدمی "لوگ لفظ اور انا" ص ۱۷۹

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔اسلم فرخی،ڈاکٹر "آج کی کتاب" مشمولہ، سلسلہ، گلشن اقبال کراچی ۲۰۰۶ء، ص ۲۳

۴۵۔ آخری آدمی "لوگ لفظ اور انا" ص ۱۷۹

۴۶۔ ایضاً

۴۷۔رانی باجی "زوال دکھ"، ص۱۰۸

۴۸۔ ایضاً

۴۹۔وقت کی امر بیل "لوگ لفظ اورانا"، ص۱۰۹

۵۰۔ ایضاً

۵۱۔ ایضاً

۵۲۔مراجعت "زوال دکھ"، ص۱۶۱

۵۳۔ ایضاً

باب سوم

شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمت کے ثقافتی عناصر

الف۔ رسم ورواج

ثقافت

ثقافت کسی بھی سماج گروہ اور طبقے کی تہذیب کا نام ہے ہر گروہ قوم اور سماج کی علیحدہ ثقافت ہوتی ہے اور یہی ثقافت قوم کی پہچان کا ذریعہ بنتی ہے۔

ای جی ٹیلر اس بارے میں لکھتے ہیں:

"ثقافت سے مراد وہ علم، فن، قانون ورسم ورواج، عادات، خصلتیں اور صلاحیتوں کا مجموعہ ہے۔"(۱)

ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے اور ثقافت لفظ ثقف سے نکلا ہے اس کے معنی درست کرنا سنوارنا بل نکالنا عقل مندی اور مہارت کے ہیں انگریزی میں ثقافت کے لیے کلچر کا لفظ استعمال ہوتا ہے کلچر کے معنی کسی ذات کی ذہنی وجسمانی نشوونما ہے ثقافت کسی بھی قوم کا اظہار ہے اور سماج میں رہنے والے افراد کی زندگیوں کا نمونہ پیش کرتی ہے یعنی ان کے طرز زندگی کی نمائندگی کرتی ہے ثقافت اقدار کی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے۔

اے بی ڈبلیو کے خیال میں:

> "ثقافت سے مراد علوم، اعمال اور عقائد کے متعلق عینی طریقوں کا وہ نظام ہے جس کی ترسیل معاشرتی طور پر کی گئی ہو اور اس میں وہ مادی اشیاء بھی شامل ہوں جنہیں علم وعمل وجود میں لاتے ہیں۔"(۲)

کلچر کے لیے عربی زبان میں تہذیب وتمدن استعمال ہوتا ہے لازمی تہذیب وتمدن کے معنی سنوارنا مرمت کرنا پاکیزہ بنانا وغیرہ کے تہذیب وتمدن کو کسی بھی قوم کی خوشحالی کا نشان سمجھا جاتا ہے ثقافت ہر گروہ کی ایک دوسرے سے ملتی ہیں کلچر کے معنی لاطینی زبان میں کسی درخت یا پودے کو کاٹنا تراشنا کے ہیں تاکہ پودے میں نئی شاخیں پھوٹیں ثقافت نسل در نسل منتقل ہوتی ہے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتے ہوئے اس میں کچھ تبدیلیاں ہو جاتی ہیں اور ہر زمانہ ثقافت کو اپنے انداز سے لیتا ہے اپنی ضروریات کے مطابق کچھ ردوبدل کے ساتھ اپناتا ہے لیکن ثقافت کے ضروری اجزا اور پہلو قائم رہتے اور اگلے زمانے میں یہ منتقل ہو

جاتے ہیں ثقافت نسل در نسل انسانی تجربات کو جمع کر کے آگے منتقل کرتی ہے اور اسے زندگی کا معیار بڑھتا ہے اور اعلی مقاصد اور اقدار بنتی ہیں ہیں۔

ہیگل جرمن فلسفی ہے ثقافت کے بارے میں کہتے ہیں:

"دنیا کی ہر ثقافت ایک اکائی وحدت وجامیعت ہوتی ہے اور اس کی ساخت میں سماج، اخلاقی، ذھنی، مذھبی، جمالیاتی اور دیگر کئی عناصر شامل ہوتے ہیں۔"(۳)

گیسٹولی بان نے اپنی کتاب Civilisation Dies Arabes میں لکھا ہے:

"تاریخ عالم دنیا کی ثقافتوں مجموعہ ہے تاریخ ایسا کپڑا ہے جس کے تار دنیا کی ثقافتیں ہیں یہ اجزا اور عناصر کپڑے کے دھاگوں کی طرح ایکدوسرے سے بندھے ہوتے ہیں۔" (۴)

فریڈ مین نے ثقافت کے متعلق کہا کہ:

"ثقافت کو انسان کی معاشرتی ورثہ کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔"(۵)

الیف ای میرل کے خیال میں:

"ثقافت معاشرتی بین عمل کی پیداوار ہے اور اپنے وجود کے لئے معاشرہ کے دوام پر انحصار کرتی ہے۔" (۶)

ثقافت لوگوں کے آپس کے میل جول اور تعلقات سے جنم لیتی ہے جب افراد ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں تو اپنے کردار اور عقائد اور اپنی عادات ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں اس طرح ہم ایک دوسرے پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں اور ثقافت کو پروان چڑھاتے ہیں۔

ابن خلدون اپنی کتاب ال عمران میں ثقافت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انسان کی فوری اور ناگزیر ضروریات اسے اس امر پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ گروہوں میں رہے جب معاشرہ قائم ہو جاتا ہے تو ثقافت جنم لیتی ہے کیونکہ اس کے زریعہ انسانی حاجات عمدہ طریقے سے تکمیل پاتی ہیں۔"(۷)

انسان کے اپنے بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے گروہ بناتا ہے مل کر رہنے سے اپنے لئے تحفظ حاصل کرتا ہے اس طرح ایک دوسرے سے پیار اور ہمدردی کا احساسات جاگتے ہیں جب ایک گروہ کی شکل

اختیار کر لیتے ہیں تو لوگوں کی عادات خصلتیں زبان اور پینا پہننا سب مل کر ایک ثقافت کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ لوگ کچھ باتیں اپنے سے پہلی نسل سے سیکھتے ہیں ابن خلدون کے مطابق ثقافت کے دو درجے ہیں ایک بدوی دوسرا خضروی۔

بدوی درجے میں لوگوں کی زندگی سادہ تھی یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے اور بھیڑ بکریاں پالا کرتے تھے ان کی زندگی سادہ تھی اور ان کی دو باتیں بہت خاص تھی ان میں اتفاق تھا اور یکجہتی تھی ان کی زندگی اور رہن نین سادہ طریقے سے لوگ سادہ کھانا کھاتے سادہ لباس پہنتے تھے اس وجہ سے ان کی صحت اچھی تک کردار اور اخلاق بہت اچھے خاندان اور مذہب کی وجہ سے معاشرے میں پیار و محبت ایک دوسرے سے ہمدردی اور اتفاق خونی رشتوں کی بنا پر قبیلے کے لوگ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے ان کے مفادات اور خطرات مشترک تھے قدیم معاشرے میں جب پیسہ آتا ہے تو لوگ آرام طلب ہو جاتے ہیں یعنی تن آسانی آجاتی ہے اور پھر ریاست کی ضرورت محسوس ہوتی ہے لوگ دیہات سے شہروں کی جانب ہجرت کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ شہروں میں سامان آسائش دیہات کی نسبت زیادہ ہوتے اور ریاست کے قیام سے تہذیب کا راستہ کھل جاتا ہے ثقافت کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے اور یہ کسی بھی معاشرے کے لیے روح کا درجہ رکھتی ہے علوم وفنون اخلاقی و معاشرتی رسوم افکار و عقائد سب ثقافت کا حصہ ہے ہمیں اپنی زندگی میں روایات و اقدار اور ثقافت کی ضرورت ہوتی ہے زندگی کا رہن سے میل جول انداز گفتگو اور شادی بیاہ کی رسومات کا حصہ ہے اور میل جول رسم ورواج سے اتحاد پیدا ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کے ثقافت کے بارے میں نظریات و خیالات ان کی نظم و نثر دونوں میں موجود ہیں ان کے نزدیک تاریخ ثقافت کا سرچشمہ ہے ان کا قول ہے:

> "تمدن کا تعلق ظاہری آداب و رسوم سے ہے جبکہ تہزیب انسان کی باطنی اور زھنی کیفیتوں سے ہے۔"(۸)

عربی فارسی اور اردو میں لفظ تہذیب کلچر کے لئے استعمال ہوتا ہے اردو میں تہذیب کے معنی شائستگی کے جسے اگر ہم کسی شخص کے بارے میں یہ کہیں کہ وہ شخص بہت مہذب ہے تو اس سے مراد اس شخص کے بیٹے اٹھنے کھانے پینے کے کے روایتی معیار کے مطابق ہیں۔

سر سید احمد خان نے اپنے رسالے تہذیب الاخلاق میں تہذیب پر مضامین لکھے وہ کہتے ہیں:

"جب ایک گروہ انسانوں کا ایک جگہ اکٹھا ہو کر بستا ہے تو اکثر ان کی ضرورتیں
اور چاہتیں، غذایں، معلومات خیالات، مسرت، نفرت سب ایک سی ہوتی ہیں
اور یہی مجموعی خوہش تبادلہ اس گروہ کی سویلیزیشن ہے۔"(۹)

ہماری زندگی کے روزمرہ کے کام ہماری ضروریات ہماری خواہشیں ہمارے احساسات محبتں اور نفرتیں سب مل کر ہماری ثقافت کا حصہ بنتی ہیں۔ فیض احمد فیض کے نزدیک ثقافت کے تین اجزا ہی ایک قوم کے عقائد روایات و اقدار جن پر قوم کو یقین ہو۔ قوم کے زندگی گزارنے کے طریقے یعنی اخلاقیات، آداب، فنون یہ تینوں کسی بھی قوم میں ایک دوسرے پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں اور ان تینوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے ان کہ خیال میں:

" ثقافت زندگی سے الگ کوئی چیز نہی ہوتی، یہ داخلی اقدار کا نام ہے اور
ظاہری طور پر طریق زندگی کا بھی۔"(۱۰)

ثقافت کسی بھی سماج میں روح کی طرح ہوتی ہے علاقے کے ملنے جلنے رہنے سہنے موسم کھیل کود اور شادی بیاہ کی رسمیں سب ثقافت کا حصہ ہوتی ہیں اخلاقیات عقائد و افکار اور معاشرتی رسوم جب ملتے ہیں تو ثقافت جنم لیتی ہے اور یہ تمام باتیں اور رسمیں انسانوں میں اتفاق یک جہتی اور محبت پیدا کرتی ہیں ثقافت اور انسان ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں یعنی ثقافت انسانوں سے اپنا وجود بناتی ہے بغیر انسان کے ثقافت نہیں ہو سکتی زبان کی تخلیق انسان کی سب سے بڑی سماجی تخلیق ہے زبان کی وجہ سے انسان اپنے خیالات محسوسات کا اظہار کرتا ہے اور اشیاء کا زمانہ سے تعلق بناتا ہے وہ گزرے زمانے اور آنے والے زمانوں کے بارے میں بات کرتا ہے ان سب باتوں سے وہ آنے والے لوگوں کے لئے ثقافت بناتا ہے اور آنے والی اگلی نسل اس سے مستفید ہوتی ہے انسان کو سماجی حیوان کہا گیا وہ اس لئے کہ وہ سماج میں رہتا ہے اور سماجی رابطہ گاہیں قائم کرتا ہے ثقافت تاریخی طور پر ایک ایسا خاکہ ہے جس میں انسان اپنے عمل و دخل ضرور یہ حافظ اور میری ملاقات سے رنگ بھرتا ہے اور افراد کی کردار سازی کرتا ہے جب معاشرے کی مادی اور اخلاقی قدریں اکٹھی ہوتی ہیں تو ثقافت اپنا وجود بناتی ہے۔ ثقافت رسوم و رواج میں صرف ناچ گانے اور تفریح کا نام نہیں بلکہ نہایت سنجیدہ عمل بھی ہے ہے اور اس کا فلسفہ حیات مثبت ہے جس میں جمالیاتی اقدار اور سیاسی و مذہبی اقدار کا حسین امتزاج اور جس میں انسان کی ظاہر و باطن کی تربیت بہتر انداز میں ہو سکے ان سب سے انسان میں پاکیزگی اور اجتماعیت کا احساس پیدا ہوتا ہے زندگی مقصدیت ہے ان سب باتوں کے علاوہ انسان کا عملی پہلو بھی بہت اہم

ہے جس کو کردار کہتے ہیں کردار انفرادی اور معاشرتی ہوتا ہے انسان کا کردار اور معاشرتی کردار معاشرے کی اکثریت کا کردار ہوتا ہے۔

مظہر حسین ڈاکٹر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> "منسب احتیاط تربیت اور دیگر تشریط کی مدد سے معاشرتی ماحول، توارث اور دیگر بیرونی عوامل سے آزاد اور بے نیاز مستحسن اور دلاویز کردار کی تخلیق کی جاسکتی ہے۔"(۱۱)

جب ایک بچہ دنیا میں آتا ہے تو اپنی انفرادیت رکھتا ہے بعد میں اس کے گھر اور خاندان کا کردار عادات اس پر اثر انداز ہوتی ہیں بچہ اپنے ماحول سے سیکھتا ہے اس کی انفرادیت، خاندان اور دوسرے افراد سے تعلق اس کا کردار بناتا ہے ثقافت میں چیزیں نسل در نسل چلتی ہیں ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتے پہنچتے کچھ تبدیل ہو جاتی ہیں ثقافت کو زمانہ اپنے انداز سے لیتا ہے یعنی اس میں اپنی ضروریات کے مطابق ردوبدل کرتا ہے لیکن ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ثقافت کے اہم اجزا میں تبدیلی نہیں آتی وہ اسی طرح قائم رہتے ہیں ثقافت کی ابتدا زبان وعلامات سے ہوتی ہے اور ان کے زریعے ثقافت آسانی سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہے جب خاندان میں کسی بچے کی پیدائش ہوتی ہے تو اس بچے کی دیکھ بھال اور پرورش کے لئے اس کا خاندان موجود ہوتا ہے جو اس کی مذہبی عقائد اور تجربے سے اس کی تربیت کرتا ہے اور تحفظ فراہم کرتا ہے انسان معاشرے میں رہ کر ثقافت کا حصہ بنتا ہے اور سیکھتا ہے ثقافت دو قسم کی ہوتی ہے مادی اور غیر مادی ثقافت۔ مادی ثقافت میں وہ اشیاء ہوتی ہیں جو طبعی خواص رکھتی ہیں ان کو انسان نے اپنے آرام و آسائش اور حفاظت کے لئے مسلسل محنت اور جدوجہد سے بنایا ہے مادی ثقافت میں وہ ٹھوس اشیاء جیسے اوزار، گھر، سڑکیں آلات مشین، خوراک اور دیگر گھریلو سامان شامل ہیں۔ غیر مادی ثقافت میں شامل اشیاء جسمانی نہیں ہوتیں یعنی وہ جسم نہیں رکھتیں۔ غیر مادی ثقافت میں انسانی تخلیقات عقائد روایات، اقدار زبان اور معیارات شامل ہیں معیارات کے زریعے معاشرہ اس میں بسنے والے لوگوں کے طرز عمل کی رہنمائی کرتا ہے قدریں عمل کے اصول ہیں جو ہمیں صحیح اور غلط میں تمیز سکھاتی ہیں ہر ثقافت کی اپنی قدریں ہوتی ہیں عقائد خاندان سے ہی سیکھے جاتے ہیں یہ نسل در نسل چلتے ہیں عقائد مذہبی بھی ہوتے ہیں وہ یہ باتیں ہوتی ہیں جو سالہاسال سے چلی آرہی ہیں اور سچ ثابت ہوتی ہیں لوگوں کا ان پر یقین ہوتا ہے زبان کسی بھی گروہ یا معاشرے کی پہچان

ہوتی ہے یہ علامات کا نظام ہے جو آپس میں بات کرنے دوسرے سے روابط رکھنے میں مدد دیتا ہے دنیا کی ہر تہذیب نئی ہوں یا پرانی اس میں چار عناصر ترکیبی شامل ہوتے ہیں

۱۔ سماجی اقدار

۲۔ فکر و احساس

۳۔ طبعی حالات

۴۔ آلات و اوزار

یہ عناصر ہر تہذیب میں موجود ہوتے ہیں اس میں سرد علاقے ہوں یا گرم یا مشرق و مغرب کوئی فرق نہیں ہوتا یہ چار عناصر ترکیبی تہذیب کا حصہ ہوتے ہیں طبی حالات یعنی ہر تہذیب کا اپنا جغرافیہ محل وقوع ہوتا ہے اس کے پہاڑ دریا جنگل میدان اس کے پھل آب و ہوا موسم اور چرند پرند یہاں پر بسنے والے لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں یہ خارجی حالات انسان کی شخصیت کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں میدانی علاقوں کی تہزیب برف پوش علاقوں سے مختلف ہوتی ہے اسی طرح دریا کے کنارے بسنے والوں کی اور پہاڑی لوگوں کی تہذیب فرق ہوتی ہے کسی بھی ثقافت کی ترقی کا دارومدار اس کے اوزار اور آلات کی ترقی میں پوشیدہ عقل و شعور انسانی خصلت ہے۔

ثقافتی اقدار

اقدار وہ اصول و قوانین ہیں جو افراد کو بہترین انسان بننے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں اقدار ہماری ترجیحات بتاتی ہیں یہ وہ عقائد ہیں جو انسان کو دو انسانوں یا دو صورتحال کے درمیان انتخاب کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں اقدار لاطینی لفظ والیر سے ہے اس کے معنی ہیں مضبوط ہونا یہ وہ اصول اور خوبیاں ہیں جن کو کسی معاشرے میں عزت و توقیر حاصل ہوتی ہے یہ اس معاشرے کی پہچان ہوتی ہیں یہ اقدار اگر فرد کی روزمرہ زندگی میں شامل ہوتی ہیں تو فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں یہ قدریں اصول و قوانین کے ذریعے نافذ نہیں ہوتی بلکہ ان اقدار کے پیچھے صدیوں کی تاریخی روایات افراد کی محنت تجربہ اور مشاہدات شامل ہوتے ہیں۔

شیاماچرن اقدار کے بارے میں کہتے ہیں:

"قدریں سماجی نظام کی بنیادی ضرورتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔"(۱۲)

پرانے زمانے کے لوگ اپنی اقدار پر سختی سے عمل پیرا ہوتے تھے اور ان کو نہ ماننے والوں کو سزا دیتے تھے اور برادری اس شخص سے ہر قسم کا ناتا توڑ لیتی تھی ان سب باتوں کے خوف سے لوگ ان قدار سے انحراف نہیں کرتے تھے اور اپنی اقدار کی سختی سے پیروی کرتے تھے کسی بھی سماج و معاشرے کی بقا میں اقتدار کا اہم رول ہے ان اقدار پر عمل نہ ہو تو اس کا خاتمہ یقینی ہو جاتا ہے ثقافتی اقدار ثقافت کا بنیادی حصہ ہوتی ہیں ان اقتدار میں عقائد روایات زبانیں اور رواج شامل ہیں ان اصول اور قواعد کی وجہ سے افراد معاشرے میں طرز عمل اپناتے ہیں یہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے ہیں دنیا کا کوئی بھی خطہ جہاں بنی نو انسان کوئی معاشرہ بستی بساتا ہے وہیں پر ثقافت شروع ہو جاتی ہے یعنی وہیں پر ثقافت کا وجود ہوتا ہے اس میں تمام لوگ مل کر اپنی روایت عقائد اور عمل سے اقدار بناتے ہیں ثقافت کسی بھی معاشرے کی روحانی نفسیاتی اور معاشرتی اثاثہ ہوتی ہیں ثقافت کی دو صورتیں ہیں ایک ظاہری دوسری باطنی ظاہری صورت کے جزو شعوری اور غیر شعوری ہیں باطنی پہلو وہ عقائد ہیں جن کو کوئی بھی معاشرہ مانتا اور یقین کرتا ہے یہ قدریں باطنی طور پر معاشرے میں موجود ہوتی ہیں۔

عبدالقادر عمادی اس بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"ہر سماجی گروہ کے کچھ سماجی اقدار قائدے اور اصول ہوتے ہیں۔"(۱۳)

معاشرہ میں کچھ چیزیں اہم اور کچھ غیر کچھ صحیح اور کچھ غلط ہوتی ہیں معاشرہ جن چیزوں کو اچھا سمجھتا ہے ان کی قدر کرتا ہے ہے اور پھر یہی اچھی باتیں قدر کہلاتی ہیں ان قدروں میں معاشرے کی امنگیں خواب امیدیں اور عقائد شامل ہوتے ہیں خوبصورتی بدصورتی سلیقہ بدسلیقہ اچھائی برائی سب ثقافت کے باطنی پہلو ہیں ظاہری پہلو کی دو صورتیں شعوری اور غیر شعوری ظاہری پہلو کی شعوری صورت میں مصوری شاعری ظروف سازی فن تعمیر شامل ہیں اس کے علاوہ شاعری ناول ڈرامہ لکھنا ظاہری پہلو کا حصہ ہیں غیر شعوری صورت میں زبان خوراک رہائش اور ملنے جلنے کے طریقے ہیں ثقافت کے مادی پہلو تبدیل ہوتے رہتے ہیں انسانی زندگی کی بہتری کے لئے ان میں تبدیلی ہوتی رہنی چاہیے اقتدار میں وہ اوصاف بھی شامل ہے جو خالق کائنات نے اپنی مخلوق کی بہتری کے لئے مقرر کیے اور اگر ان اقدار کو تبدیل کیا جائے تو معاشرے میں نقصان کا باعث ہوتے ہیں اور نہ ماننے سے اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے کچھ قدریں ہر معاشرے میں تقریبا مشترک ہوتی ہیں جیسے مہمان نوازی صاف گوئی رحمدلی مظلوم سے ہمدردی وغیرہ اس کے علاوہ اس کے علاوہ بزرگوں کا احترام چھوٹوں سے پیار شادی بیاہ پر خوشی منانا اور کسی کی موت یا غم میں افسوس کرنا تقریبا تمام تہذیبوں میں موجود ہوتی

ہیں۔ بعض قدریں انفرادی بھی ہوتی ہیں جیسے کچھ اقوام میں انسان کتے سور کا گوشت کھاتے ہیں لیکن دوسری قومیں ان کو کھانے سے نفرت کرتی ہیں اور چھوٹی بھی نہیں اس طرح ہمارے معاشرے میں عریانی کو بہت برا سمجھا جاتا ہے لیکن بعض کے نزدیک اور یعنی یہ معیوب بات نہیں معیار بھی علیحدہ جیسے بعض کو عام چپٹی ناک سیاہ رنگ موٹے ہونٹوں کو خوبصورتی میں شمار کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس کچھ سفید رنگت کو حسین مانتے ہیں۔

سبط حسن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> "ہم دوسروں کی سماجی قدروں کو اپنی سماجی قدروں پر پرکھنے کے مجاز نہیں ہیں سماجی قدروں کو پرکھنے کا کوئی عالمگیر معیار ہے تو وہ یہ کہ قدروں سے افراد کی داخلی صلاحیتوں کو فروغ ملتا ہے۔"(۱۴)

اقدار معاشرے کا عکس دکھاتی ہیں بعض اوقات کسی ایک ہی سماج میں اقتدار کے معیارات مختلف ہوتے ہیں جیسے پدرسری نظام میں مردوں اور عورتوں کے اخلاقی پیمانے جدا ہیں ہمارے معاشرے میں حیا پاکیزگی اور پردہ عورت کا زیور ہے لیکن اگر یہ کسی عورت میں نہ ہو تو معاشرے کی نفرت کا شکار ہو جاتی ہے لیکن مرد کو سختی سے نہیں لیا جاتا اسی طرح طبقاتی سماج میں عام آدمی اور اونچے طبقہ کے لئے اقدار کے پیمانے علیحدہ علیحدہ ہیں جیسے جاگیرداری نظام میں ایک اچھا مزارع اور ہاری اس کو سمجھا جاتا ہے جس کا یہ وصف ہو کہ جاگیردار کا ہر حکم بلاچون وچرا مانے اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہے اس کے لئے محنت کرے اور جو مل جائے اس پر شکر کرے اور حرف شکایت زبان پر نہ لائے وڈیرا اور جاگیردار وہ افضل ہے جو دلیر ہوں سب پر اس کی ہیبت ہو پیسے کو اپنے عیش وعشرت میں لوٹ آئے اور غریب کا خون چوسے یہ تضاد طبقاتی سماجوں کی اقدار میں موجود ہے اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں اچھا ملازم وہ ہے جو محنتی ہو مالک کی اطاعت اپنا فرض سمجھتا ہوں اپنی تنخواہ اور جو بھی صلہ ملتا رہا ہے اس پر اعتراض نہ کرے اور کسی سیاسی سرگرمی میں جلسے جلوس اور یونین کے کسی کام میں حصہ نہ لے لیکن افسر اور مالک کے اوصاف جدا ہے رشوت جوڑ خوشامد جھوٹ اور دوسرے کام نکلوانے کے طریقے سے جانتا ہو اس کی شخصیت میں جارحیت ہو۔ سماج میں اچھی اقدار کا فروغ اور غلط اقدار کو ختم ہونا چاہئے معاشرے میں امن وسلامتی کی فضا اچھی اقدار کے فروغ سے قائم ہو سکتی ہے اور غلط اقدار کو معاشرے سے ختم ہونا بہت ضروری ہے جو ناسور کی طرح ہمارے معاشرے میں پھیل رہی ہیں جیسے شادی بیاہ پر اسراف جہیز کی لعنت اور معاشرے میں دولت کی نمائش وغیرہ نہ کم آمدن والے طبقات میں

احساس محرومی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں غریب کی بیٹی جہیز نہ ہونے کی صورت میں کنواری رہ جاتی ہے۔

رسم ورواج

دنیا کا کوئی بھی معاشرہ رسم ورواج و اقدار سے خالی نہیں دنیا میں بہت سی رسم اور رواج موجود ہیں ان میں سے زیادہ تر سمیں انسان نے اپنی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے بنایں اور پھر رفتہ رفتہ وہ معاشرے کا حصہ بن گیں یوں یہ رسم ورواج انسان کی ضرورت بن گئیں انسان کی فطرت ہے کہ وہ زندگی کی یکسانیت سے جلد اکتا جاتا ہے رواج انسان کی زندگی میں جمود نہیں آنے دیتے بعض رسمیں موسم کے بدلنے پر ادا کی جاتی ہیں ہیں اور تفریح مہیا کرتی ہیں اردو لغت میں رسم ورواج کے معنی چلن، ریت طور طریقے یا دستور کے ہیں۔
حنا رضوی اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

"انسانی معاشرے میں مشترکہ طور پر کئے جانے والے وہ اعمال جو علاقے
تہذیب اور مذہب سے منسلک ہوں رسم ورواج کہلاتے ہیں۔"(۱۵)

ماہرین سماجیات کے مطابق جب سے انسان نے مل جل کر رہنا شروع کیا تب سے ہی رسم ورواج کی ابتدا ہو گی انسان نے اپنی ضروریات کو حاصل کرنے اور اپنی زندگی کو محفوظ بنانے کے لیے کچھ اصول وضوابط بنائے مل جل کر رہنے کے لیے ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہونے کے بعد آپس میں دوسروں کی خوشیوں میں شامل ہو کر خوشی منانا بیماری اور مر جانے کی صورت میں دوسروں کے دکھ میں شریک ہونا شروع کیا اور قدرتی آفات اور لڑائی سے خود اور دوسروں کو کیسے محفوظ رکھنا ہے یہ سیکھا زندگی کو بہتر بنانے کے لئے جانور کے شکار کار کے لئے اوزار اور طریقوں کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد اور رسم سیکھیں ماہرین کے مطابق افریقہ ایشیا اور یورپ کے غاروں سے بہت سے نقش و نگار کا پتہ چلا جو قدیم انسانوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی مذہبی رسومات کے لیے بنائے تھے انہی میں ایک تصویر میں ایک مذہبی رہنما شکار کے لیے رسم ادا کر رہا ہے آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر بستے رہے زیادہ تر بستیاں پانی کے گرد بسائیں اور یہ بستیاں رسم ورواج پھیلانے کا بھی سبب بنیں نئے خطے آباد ہونے سے کچھ رسموں کو تو لوگ آپس کی رضامندی سے قبول کر لیتے تھے اور کچھ کو زبردستی منوایا جاتا تھا انسان جو کچھ بچپن سے سیکھتا ہے اس کو پسند کرتا ہے اور اس میں خوشی محسوس کرتا ہے اسی لئے ہر قوم اپنے ملک کے رسم و رواج کو پسند کرتی ہے اور اپنی رسموں کو

دوسروں سے بہتر جانتی ہے دو ہزار سال قبل آریائی قبیلے دراوڑی قوم کو شکست دینے کے بعد وادی سندھ پر حکمرانی کی دراوڈی کے عقائد کو شکست نہ دے سکے اور دراوڑی ان سے مل جل کر رہنے سے آریائی قوم نے ان کے عقائد اپنا لئے جو کہ آج بھی ہندو معاشرے کا حصہ ہیں ہجرت سے پہلے مظاہر فطرت کی پوجا کرتے تھے لیکن بعد میں بت پرستی کرنے لگے پہلے گوشت کھاتے تھے لیکن ان کی صحبت میں گوشت کھانا ترک کی اور گائے کی پوجا شروع کی عورت کو عزت و مرتبہ حاصل تھا وہ مذہبی رتبہ حاصل کر سکتی تھی اور دوسری شادی کی اجازت کے ساتھ رہتے ہوئے عورت کی اہمیت کم ہوگئی اور شوہر کے مرنے کے بعد بیوی ستی ہو جاتی تھی مر جاتی تھی اور جب انگریز اس خطے میں آئے تو انہوں نے اپنے اثرات یہاں کے لوگوں پر قائم کی اور اس خطے میں غیر ملکیوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہا ایرانی ترکی افغان یونانی اور چینی اس خطے میں آئے اور یہاں کے لوگوں کی زندگیوں پر پر اثر ڈالا۔

حنا رضوی اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

> "برصغیر میں یونانیوں کے سو سالہ اقتدار نے اس علاقے کو فن مجسمہ سازی کیلنڈر سازی سکہ سازی کے ساتھ ساتھ فن اسٹیج و ڈرامہ سازی بھی عطا کی۔"(۱۶)

برصغیر میں مسلمانوں کی تہذیب سے گہرے اثرات مرتب ہوے ان کا رہن سہن اور پہناوے کے علاوہ انکے کھانے بھی یہاں کے لوگوں کو پسند آئے برصغیر میں آنے والے مغل حکمرانوں نے رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے محلوں میں ہندو تہواروں کو منایا ہندو عورتوں سے شادیاں بھی کیں ان اقدامات سے مسلمانوں کے عقائد میں تو کوئی تبدیلی نہ آئی لیکن سماجی طور پر اثرات کو قبول کیا اور بہت سی رسموں کو اپنا لیا یہ اثرات آج بھی ہمیں اپنے معاشرے میں دکھائی دیتے ہیں جیسے اسلام سادگی کا درس دیتا ہے اور اسراف سے منع کیا گیا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں پیدائش سے شادی تک کی تمام رسموں میں ہندوانہ عکس دکھائی دیتا شادیوں پر بہت زیادہ خرچ کیا جاتا ہے رسم و رواج معاشرے کی قبول روایات ہوتی ہیں اور افراد اپنی حدود میں رہتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں کچھ افراد ان روایات اور رسم و رواج سے انحراف اور یا عمل نہ کریں تو ان فراد کو معاشرے کے دوسرے افراد کی جانب سے نفرت اور غصے کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے بعض قومیں تو اس شخص کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتی ہیں اور بسا اوقات تو برادری اس کا بائیکاٹ کر دیتی ہے تاکہ لوگ

اس بات سے سبق حاصل کریں اور معاشرے کے دوسرے افراد اس نفرت اور غصے سے بچنے کے لیے ان رسموں رواج اور روایات کی پابندی کرتے ہیں۔

ولیم سمنر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"یہ ایسی روائتی رسوم و قیود ہیں جن کے متعلق یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کرلی گئی ہے کہ معاشرے میں باوقار مطابقت کے لئے انکی پابندی لازمی ہے اگرچہ ان کا تعلق کسی قسم کے مجازی حکم سے نہی ہوتا، تاہم انحراف کرنے والوں کا سخت مواخذہ کیا جاسکتا ہے۔"(۱۷)

رسم ورواج پر مذہب اور قانون کا اچھا خاصا دخل رہتا ہے اور اس کے نا ماننے والوں کو اکثر جسمانی یا مالی سزا بھی ہو سکتی ہے ہندو معاشرے میں ایک شادی کا لیکن عرب معاشروں میں کئی شادیاں کی جاتی ہیں اور ایک شادی کرنے والے کو عجیب نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

سیوبر اس کے بارے میں کہتے ہیں:

"یہ عوام کے افعال و خیالات کو ڈھالنے والے معروف آداب ہیں جن کی پابندی لازمی ہے۔"(۱۸)

رسم ورواج کسی بھی معاشرے کی پہچان ہوتے ہیں اور اقوام اپنے رسم ورواج پر فخر کرتی ہیں ہمارے آباؤ اجداد کی قربانیوں کے صلے میں ہم نے پاکستان کو حاصل کیا یہ ملک اس لیے حاصل کیا گیا تھا کے مسلمان آزادی کے ساتھ یہاں رہ کر اپنے مذہب اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں ہم بحیثیت مسلمان اپنے دینی فرائض نماز روزہ حج زکوۃ تو بخوبی ادا کرتے ہیں لیکن ہمارے سماج میں کچھ روایتیں اور رسمیں ایسی ہیں جن کا اسلام سے تعلق نہیں یہ رسمیں ہندو معاشرے سے ہم میں آئی ہیں برصغیر میں ایک بڑے عرصے تک مسلمان اس معاشرے میں ہندوؤں کے ساتھ رہے اور ان کی رسومات کا اثر لیا یہ اثرات آج تک قائم ہیں معاشرے میں موجود شادی بیاہ کی بہت سی رسمیں ہندو سماج کی رسمیں ہیں شادی بیاہ پر اسراف کرنا اور مہندی اور مایوں کے فنکشنز پر ناچ گانا اور بیٹی کی شادی پر لاکھوں کا جہیز دینا جہیز کی رسم معاشرے میں ناسور کی طرح پھیل گئی ہے بیٹی کو اس لئے جہیز دیا جاتا ہے کہ اس کی سسرال میں قدر ہو لیکن جہیز اچھی زندگی کی ضمانت نہی ہے اکثر دیکھنے میں ایا ہے کہ لاکھوں کا جہیز لیکر جانے والی لڑکی سسرال میں سکھی نہی ہوتی اسراف اور بے جا فضول خرچی اسلام کے اصولوں میں نہیں ہے اس سے غریب کی بیٹی بن بیاہی بیٹھی رہتی ہے لوگ امیر کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہیں صرف دولت کے لالچ میں یہ سب باتیں معاشرے میں بہت سی برائیوں کو جنم دے

رہی ہیں امیر اور غریب کا فرق بڑھ رہا ہے اور جن کے پاس دولت نہیں وہ ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو کر دولت حاصل کرنے کے غلط طریقے اختیار کرتے ہیں معاشرے میں عدم برداشت نفرت بڑھ رہی ہے آئے دن مسائل سے تنگ آکر خودکشیاں کر رہے ہیں ایک ایسے معاشرے کی ضرورت ہے جہاں اسلامی اصولوں پر رسمیں نبھائی جائیں جن سے کسی کی حق تلفی نہ ہو اور غلط رسموں کو معاشرے سے نکالنے کے لیے کام کیا جائے ادیب اپنی کہانیاں معاشرے سے چنتا ہے اور وہی کچھ لکھتا ہے جو اپنے ارد گرد دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور وہ جہاں کہیں معاشرے میں کچھ غلط اقدار کی وجہ سے بگاڑ دیکھتا تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان غلط روایات ورسم ورواج کے خلاف قلم اٹھائے ایک تخلیق کار کی نظر تیز اور مشاہدہ گہرا ہوتا۔ شہناز شورو کہانی کار کے ساتھ ساتھ ذمہ دار اور حساس طبیعت شخصیت ہیں وہ معاشرے میں موجود مسائل پر لکھنا اپنا فرض سمجھتی ہیں انہوں نے اپنے افسانوں میں اندرون سندھ میں جہالت رسم ورواج کے خلاف احتجاج رقم کیا ہے۔

جمیل خان ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شہناز شورو کے افسانے روایات کی زنجیروں کو توڑنے پر اکساتے ہیں اور
بدبودار فرسودہ رسموں کی بوسیدگی کی نشاندہی کرتے ہیں"(۱۹)

انہوں نے معاشرے کے حقائق کو پیش کیا ہے وہ منافق رویوں کے خلاف لکھتی ہیں اور جو دیکھتی ہے پوری سچائی کے ساتھ بیان کرتی ہیں وہ مصلحت کے پردے نہیں ڈالتیں۔

فطرت اور روائیت

"فطرت اور روایت" شہناز شورو کی دوسری کتاب زوال دکھ کی دوسری کہانی ہے یہ سماج کی رسم وٹے سٹے کے گرد گھومتی ہے شہناز کی تحریروں میں سماجی و ثقافتی ماندہیں جن کی وجہ سے مزاحمت واحتجاج موجود ہے اس کہانی میں رسم وٹے سٹے پر کھل کر بات کی گئی ہے جس میں معاشرے میں ناسور کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں اس کے دو اہم کردار امیر اور سبھاگی ہیں دونوں بہن بھائی ہیں اور دونوں کی شادی سے کہانی آگے بڑھتی ہے اور مسائل کی نشاندہی ہوتی ہے کہانی کا آغاز امیر اور سبھاگی کی ماں کی باتوں سے ہوتا ہے وہ برادری کی عورتوں کے درمیان بیٹھی باتیں کرتی ہوئی کہہ رہی ہیں:

"خریدی ہے تو کیا ہوا کوئی معمولی نہ سمجھیں اسے پورے سوا لاکھ بھرے
ہیں امیر کے باپ نے جب ملی ہے حوروں جیسی۔"(۲۰)

امیر اکلوتا بیٹا اور پانچ بہنوں کا بھائی ہے امیر کے ماموں کا ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں ہیں امیر اور سبھاگی کا رشتہ وٹے سٹے میں اپنے ماموں کے گھر طے ہوتا ہے سبھاگی کا منگیتر بیمار ہو کر مر جاتا ہے سبھاگی اپنے منگیتر کے مرنے کے بعد دوبارہ شادی نہیں کر سکتی بلکہ اپنے منگیتر کے نام پر بیٹھنے کے لئے مجبور ہے اور پھر امیر کا بھی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے سبھاگی کی پھوپھی کی شادی بھی بدلے کا رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوئی جس کی وجہ سے وہ بھی گھر میں ہی رہتی ہے۔

> "سبھاگی کی پھپھی کی تو کہیں بات بھی طے نہیں ہوئی تھی معاملہ وہی ادلے بدلے کا وہ اکیلی تھی اور سب چھوٹے بڑے لڑکوں کی نسبتیں طے تھیں۔۔۔ تو کیا ہوا۔۔۔ پھپھو پر خدا نے ایسا کشف اُتارا کہ وہ عالم جوانی میں ہی ولی بن گئیں۔"(۲۱)

اس افسانے میں عورت کی جنسی اور جذباتی ناآسودگی کو جرات مندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ہمارا معاشرہ عام طور پر ان احساسات کا ذکر کرنا ہی نہیں چاہتا اس افسانے کی کردار سبھاگی اور اس کی پھوپی کی ناآسودہ زندگی اور جذباتی اور جنسی کے کیفیت کا بیان ہے کہ پھوپی کیسے ایک پیرنی یادم والی بن کر اپنے احساسات کو دنیا سے چھپاتی ہے اور سبھاگی ایک گناہ کی دلدل میں پھنس کر ایک بچے کو جنم دیتی ہے۔اس افسانے میں مرد جو چاہے کر سکتا ہے اگر رشتہ ٹوٹ جائے یا نہ ملے تو لڑکی خرید سکتا ہے اور لڑکی اگر منگیتر یا شوہر مر جائے تو اس کو اس کے نام پر ساری زندگی گزارنا پڑتی ہے یہ ہمارے سماج کا المیہ ہے یہاں مرد اور عورت کے لیے دہرا تضاد ہے۔ اس معاشرے میں عورت کے جذبات احساسات یا سوچ کی فکر سے زیادہ غیرت یہ اپنی ناک اونچی رکھنا زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔

پہلا کمرہ تیسری عورت

اس افسانے میں نام نہاد پیروں کی صورتحال کا جائزہ ہے اور بہت سی ایسی نام نہاد روایات کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا ہے جس میں کبھی اپنی جائیداد کو بچانے اور کبھی اپنی اس سماج میں ناک اونچی رکھنے اور کبھی نامردی کو کیسے چھپایا جاتا ہے اور عورت قصوروار نہ بھی ہو تو اولاد پیدا نہ کرنے کے جرم میں سوتن کو برداشت کرنے اور بانجھ کہلانے کے کرب کی کہانی ہے۔ اس افسانے میں میاں فیض محمد کا کردار ایک اہم کردار ہے اور اس کی کہانی میاں فیض محمد کے گرد ہی گھومتی ہے۔ میاں فیض محمد ایک نام نہاد پیر ہے اور یہ اس کی چوتھی نسل

ہے گاؤں میں ان کی بہت شہرت ہے اور دور دراز کے گاؤں سے بھی سوالی ان کے در پر مرادوں کا حل تلاش کرنے آتے ہیں۔ یہ فیض محمد دوسروں کی مرادیں دعا اور تعویزوں سے پوری کرتے ہیں لیکن ان کا اپنا گھر اولاد کی نعمت سے محروم ہے جب ان کی پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوئی تو انہوں نے دوسری شادی کی لیکن دوسری شادی سے بھی اولاد نہ ہوئی تو تیسری شادی کر لی یہ ہمارے سماج کا المیہ ہے کی اولاد نہ ہونا عورت کا جرم سمجھا جاتا ہے اور قابل معافی بھی نہیں۔ لیکن مرد کبھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ بھی بانجھ ہو سکتا ہے لیکن پیر صاحب اپنی حقیقت کو بخوبی جانتے ہیں ۔

جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے:

"میاں جی خالی کمرے میں آئینہ اوندھا کر کے دروازے، کھڑکیاں بند کر کے اکثر سوچا کرتے تھے کہ بھلا یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا ہوتا ہے ان کورے کاغذوں پر ترچھے ٹیڑھے اعداد و شمار لکھ دینے سے؟ یا پھر عامل و معمول جیسے شکل کھینچ دینے سے؟ اور پھر ان کاغذوں کو پانی میں گھول کر بھی جانے سے۔۔۔"(۲۲)

یہ نام نہاد پیر لوگوں کے چہروں سے ان کے دکھوں کو پہچاننے کا فن سیکھ لیتے ہیں اور سادہ لوح لوگ ان کے چیز کو نہیں پہچان پاتیں اور لوگ بے وقوف بن جاتے ہیں اس سماج میں بہت سے دکھ ہیں سماج میں وہی لوگ ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور اپنی پونجی بھی لٹاتے ہیں اور میاں صاحب اس اقتباس میں اپنے فن کے بارے میں بات کرتے دکھائی دیتا ہے۔

"لوگوں کی آنکھوں میں دیکھ کر دل میں جھانکنا اور ذہنوں چھپے سوال بھانپ لینا ہی تو آیا ہے اور یہی کمائی ہے، یہی ساری پونجی ہے اسی ہنر کی بدولت یہ حویلی یہ آن، یہ شان، یہ نام، یہ شہرت و مرتبہ ہے ورنہ ہوں تو میں بھی وہی انگوٹھا چھاپ۔"(۲۳)

کہانی آگے بڑھتی ہے اور میاں فیض محمد اولاد نہ ہونے کا غم ستایا جاتا ہے وہ ہر وقت پریشان رہتے ہیں کہ ان کی جائیداد کا کون وارث ہو گا اور جب تیسری بیوی سے بھی اولاد نہیں تو لوگ باتیں بنائیں گے اور ان کی نامردی کا بھید کھل جائے گا یہی سوچتے ہوئے وہ ایک کھیل کھیلتے ہیں جس میں وہ اپنے تابعدار عبدل کو شامل کرتے ہیں۔

"عبدل! جاتو اندر جا چھوٹی بی بی کے کمرے میں، اسے اٹھا، بول میں نے بھیجا ہے
میں۔۔۔ میں جاؤں سرکار۔۔۔ "چھوٹی بی بی۔۔۔ کمرے میں۔۔۔"
"جو بول رہا ہوں سن رہا ہے نہ تو۔۔۔"
"مگر میاں جی۔۔۔ میاں جی۔۔۔ یہ آپ۔۔۔"
"پر کیا؟ بڑی سرکار کا حکم ہے عبدل۔۔۔ میں تو ایک مہرہ ہوں بس"۔ "ایسا نہ
کیجئے مالک۔۔۔ مجھ غریب پر۔"(۲۴)

اور پھر آخر میاں جی کے گھر خوشیاں آگئی جس کو تمام گاؤں سننا چاہتا تھا میاں جی کی تیسری بیوی کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ میاں جی کو وارث مل گیا اور پھر کچھ دن بعد اچانک میاں جی کی بیوی فوت ہو جاتی ہے اور عبدل بھی سانپ کے ڈسنے سے مر جاتا ہے لیکن میاں جی اپنی نامردی کو بہت سے خوبصورتی سے بچاتے ہیں اور اپنے عزت اور جائیداد کا وارث بھی پا لیتے ہیں شہناز شورو ایک بے باک لکھاری ہیں اور انہوں نے زمانے کے ناسور پر یہ بات کی ہے۔

انوار احمد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

" شہناز شورو کو اپنے معاصرین پر کئی اعتبار سے سبقت حاصل ہے وہ جرات اظہار کے نام پر وہ سنسنی خیزی ہے جی بھی پیدا نہیں کرتی جو دردناک مناظر میں بھی لذت پیدا کرتی ہے مگر وہ اپنے افسانے بنیادی تاثر کی خاطر بڑی سے بڑی بات کہنے سے چوکتی نہیں اس کی بڑی طاقت یہ ہے کہ ایک مخصوص کلچر اور سماجی نظام کے گہرے مشاہدے کے سبب معاشرے میں نظر انداز ہو جانے والے گوشے اور بے نوا لوگ اس کے تخلیقی دامن میں پناہ لیتے ہیں۔"(۲۵)

بازیافت

بازیافت کی کہانی معاشرے کے رسم و رواج میں جکڑی ہوئی عورت کی معاشرے سے مزاحمت کی کہانی ہے اس کہانی کا مرکزی کردار عطیہ نامی لڑکی ہے۔ جو معاشرے کہ بچھائے ہوئے بہت سی رسموں کے جال میں پھنسی احتجاج تو کرتی ہے لیکن اس کی شنوائی نہیں ہوتی اور اس کو یہ کہہ کر کہ زمانہ کیا کہے گا ہر بار چپ کرا دیا جاتا ہے۔ عطیہ نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی اس کی اور چار بہنیں ہیں اس کا نمبر پہلا ہے اس کی غریب گھرانے میں شادی کر دی گئی۔ عطیہ مستقبل کے سپنے سجائے جب پیا کے گھر پہنچتی ہے تو وہاں ویسا کچھ

بھی نہیں جن کے سپنے وہ لے کر آئی تھی اس گھر میں شکی شوہر تھا جو بات بے بات اس کو مارتا پیٹتا تھا زندگی اس کے لئے جہنم سے کم نہ تھی۔

"میں کیوں زندہ ہوں؟ اور پورے پانچ سال محض تین وقت کھانے، تن ڈھانپنے اور سیکس کرنے کے لیے زندہ رہی پالتو کتیا کی طرح جو ہر روز دم ہلاتی اور سوتی رہی۔"(۲۶)

پانچ سال میں عطیہ کے تین بچے ہیں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں بچے ایسے ماحول میں تھے جہاں ان کا باپ ان کی ماں عطیہ کو روز مارتا اور پھر گھر سے باہر جاتے ہوئے تالے بند کر جاتا تاکہ یہ کہیں باہر نہ جاسکے اور نہ ہی کسی سے بات کرے۔

"کتنی قید تھی وہ یہاں جو اس کا اپنا گھر تھا جہاں چھوٹے چھوٹے معصوم بچے تھے اور ان کا باپ انہیں ماں کا پہریدار مقرر کر کے باہر سے تالا لگا کر جاتا تھا وہ کسی کھڑکی یا دراز کی آڑ سے باہر جھانکتی تو خوف کی سوئیاں اندر چبھتی رہتیں۔"(۲۷)

ان تمام حالات کا ذکر عطیہ ماں سے کرتی تھی لیکن ماں ہر بار اسی کو سمجھا کر چلی جاتی تھی عطیہ کے دکھ کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے۔

"کئی بار روتے روتے ماں سے کہا تھا یہ بازو دیکھو، یہ سینہ، یہ ٹانگیں کتنی زخمی ہیں، مجھ پر تشدد کرتا ہے۔"(۲۸)

جواب آیا سارے شوہر کرتے ہیں پھر کہا ہر روز ان زخموں میں اذیت بھر دی جاتی ہے۔ماں نے کہا" آس پڑوس کو پتہ نہ چلے ہلدی اور تیل کو گرم کر کے ٹکور کر لینا" یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہر جبر کو یہ کہہ کر چھپا دیا جاتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ اسی طرح چھپاتے چھپاتے گناہ جنم لیتے ہیں اور پانی سر سے گزر جاتا ہے تب بھی تو معاشرہ چپ نہیں رہتا کیونکہ سماج کے لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔ دوسرے کا درد محسوس کرنا نہیں عطیہ بھی یہ سب کچھ زمانے کے ڈر سے سہتی رہتی ہے اور آخر ایک دن اس ظلم سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے۔

"مر جاؤں گی تو کم از کم اتنا تو ہو گا کہ روز روز کے یہ ظلم اور بچوں کے زرد ہوتے چہرے جن میں خوف کا عفریت سماتا جا رہا تھا نہ دیکھ پاؤں گی اور زندگی کو ختم

کرنے کی خواہش میں کیڑے مار دوا پی لی بے ہوشی کے عالم میں تھی ماں آگئی۔
اسپتال پہنچایا اور تھوڑی سی تگ و دو کے بعد جب گھر واپس آئی تو ماں کے پاؤں
پکڑ لئے اپنے جسم پر پڑے نیل دکھائے تو آنسو بہاتی کہنے لگی اس بار میں نے
اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے اور تمہارے باپ نے بھی۔"(۲۹)

اس کہانی میں عطیہ کا کرب الفاظ کا روپ دھارے قاری کے دل میں اترتا محسوس ہوتا ہے عطیہ کی بے بسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ کتنی بے بسی کی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ جب بھی اپنے گھر جانے کی کہتی ہے تو ماں باپ کی چار بیٹوں کی فکر لاحق ہو جاتی کہ ان کا کیا ہو گا۔ ہمارے سماج میں ابھی بھی طلاق یافتہ کو قبول نہیں کیا جاتا اور اس کے طلاق یافتہ ہونے پر باقی بہنوں کا رشتہ نہیں ہوتا کہ اگر ایک بہن نے طلاق لی ہے تو اس کی بہنیں بھی ایسی ہی ہو نگی۔ کتنا بڑا المیہ ہے جس مذہب میں طلاق کی اجازت ہے تو سماج آتی کیوں دیوار بنتا ہے اور جب یہ ظلم حد سے بڑھا تو ایک دن چپ چاپ گھر سے نکل گئی اس کے پاس نہ پیسے تھے اور نہ منزل کا نشان۔ اس طرح عطیہ گناہ کی دلدل میں جا پھنسی۔

شہناز شورو کا اسلوب بیانیہ ہے اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے ڈاکٹر طاہرہ اقبال شہناز شورو کے بارے میں کہتی ہیں۔

"موضوع کے فطری اسلوب کو پکڑ لینا اصل مشکل ہے اور شہناز کے ہر
موضوع کا موزوں ترین اسلوب اس کی گرفت میں ہوتا ہے کہ جملے اور
پیراگراف مڑ مڑ کر باز خوانی پر مجبور کرتے ہیں۔" (۳۰)

حویلی

شہناز شورو کا تعلق سندھ کے اندرون علاقے سے ہے اسی لئے ان کا مشاہدہ، وڈیرہ شاہی اور جاگیر دارانہ نظام سے کافی ہے اور اپنے افسانوں میں ان کے علاقوں میں رہنے والوں کی ذہنی و معاشی پسماندگی کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتی دکھائی دیتی ہیں۔ حویلی افسانہ میں زمانہ جاہلیت کی رسوم جو کہ ابھی بھی جاری ہیں کا بیان بہت عمدگی سے کیا گیا ہے جسے تعویذ گنڈے، کاروکاری اور لڑکیوں کا جائیداد کی خاطر قرآن سے شادی کرانا کے بھیانک روپ دکھائے ہیں کہ کسے وڈیرے اپنی جائیداد بچانے کے لیے ان لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے ان کو قرآن سے بیاہ دیا جاتا ہے اور ان کنواریوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے ان کو علیحدہ حویلی نام کرکے ایک ملازمہ بھی دی جاتی ہے اور روپیہ پیسہ بھی موجود ہوتا ہے لیکن یہ جائیداد میں حصہ دار نہیں

ہوتیں۔ یہ ان کی جسمانی، ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی احساسات کو کسی کو پرواہ نہیں ہوتی لیکن ان سسکتی جوانیاں کیسے حویلی میں رہتے ہوئے اپنی تسکین کا سامان ڈھونڈ لیتی ہیں ان کے دکھ کی جھلک اس اقتباس میں نظر آتی ہیں۔

"اب تو کمروں میں سسکیوں کا ڈیرہ تھا سسکتا ہوا عالم تھا، کئی دنوں تک گھر کہ کنگھے کو بالوں کی خوشبو نصیب نہیں ہوئی۔ مائیں بیٹیوں کے مقدر پر گریہ کی کناں تھیں۔ بہنیں اور رشتہ کی بہنیں گلے مل کر اپنے دکھوں کو بہانے کی کوشش کرتی تھیں۔۔۔ برسوں کے تجربے کار ایسے ماحول کو کئی بار دیکھنے والی شیدی عورتوں نے انہیں سہارا دینا شروع کیا ان کے دکھوں کو بانٹنا شروع کیا اور ماحول کو ایک نئی ڈگر پر لانے کی کوشش کرنے لگیں۔"(۳۱)

شہناز شورو عورت کے نازک اور اہم مسائل پر جرات سے اظہار کرتی ہیں۔ حویلی کی کہانی میں یہ سکستی ہوئی لڑکیاں کیسے زندگی کو جیتی ہیں ان لڑکیوں کا محبوب مشغلہ دربار پر جانا، وہاں اگر بتی چادر اور چڑھاوے لے جانا تھا اور نوکر ڈرائیور خانساماں اور گوالے ان خواتین کے لیے بہت اہمیت رکھتے تھے کیونکہ وہ ان کا باہر کی دنیا سے رابطے کا ذریعہ تھے اور آگے چل کر اس کہانی میں وہ لڑکیاں کیسے ناجائز بچوں کو جنتی ہیں اور پھر ان کو کیسے مار دیا جاتا ہے یا زندہ قبر میں اتارا جاتا ہے بڑی تلخ حقیقت ہے۔

عذرا اصغر اپنے مضمون میں لکھتی ہے:

"دنیا کے نفسیات دان اور ماہرین سماجیات ہزار تاویلیں دیں مگر انسانی دکھوں کا مداوا ان کی تاویلوں سے ممکن نہیں۔ ترقی یافتہ معاشروں میں بھی زندگی انسانوں کی حیوانیت اور بربریت پر آج بھی بلک بلک کر رو رہی ہیں۔"(۳۲)

لوگ لفظ اور انا

سماج کے منافق رویوں کی کہانی پر مبنی ہے اور اس نام پر شہناز شورو کے مجموعے کا نام بھی ہے یہ کہانی اس مجموعہ کی آخری کہانی ہے۔ اس کہانی کے دو کردار فوزیہ اور کمال ہیں اور سماج میں رہنے والے اپنا حصہ اس بری طرح ان کی زندگیوں میں شامل کرتے ہیں کہ ان کی ہنستی بستی زندگی آگ لگا کر تماشہ دیکھتے دکھائی دیتے ہیں اور شہناز اپنے کرداروں سے اس منافق سماج کی رسم ورواج اور اقدار پر مزاحمت واحتجاج کرتی دکھائی دیتی

ہیں۔ یہ کہانی ایک نو بیاتا جوڑے کے گرد گھومتی ہے اس جوڑے میں ایک لڑکی فوزیہ اور ایک لڑکا کمال۔ فوزیہ ایک پڑھی لکھی ہے اور زندگی کو بھرپور طریقے سے جینا چاہتی ہے۔ یہ جوڑا شادی کے بعد کمال کی ملازمت کی وجہ سے دوسرے شہر میں سرکاری کوارٹر میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔ ابھی گھر میں آئے ہوئے دو ہفتے ہی گزرے کہ تمام محلے والے ان کے گھر ان کی بیوی کی شکایات لے کر آتے ہیں۔

"اس پورے علاقے میں کوئی گھر ایسا نہیں جہاں عورتیں، لڑکیاں اچھلتی کودتی ہوں۔ بس آپ کا گھر ہے جہاں روزانہ بیڈ منٹن جیسا کھیلا جاتا ہے۔ بغل والے پڑوسی پیچ وتاب کھاتے ہوئے بولے۔۔۔
ارے بھائی کئی بار بے موقع محل میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا ہے شٹل کاک واپس لینے کے لیے۔"(۳۳)

یہ کہانی اس منافق سماج کی ایک تلخ حقیقت لیے ہوئے ہے جہاں ہم دوسروں کی عیب جوئی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جہاں اپنی عبادت کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور دوسروں کو نشانہ بنایا جاتا ہے ویسے ہی اس اقتباس سے بیڈ منٹن جیسے کھیل کو واہیات کہا جا رہا ہے وہی کھیل ٹی وی پر دیکھ کر لطف اندوز ہوتے اور سراہتے ہیں۔ اس سماج میں بسنے والے لوگ کسی کو جینے کا حق صرف اپنی سوچ کے مطابق دیتے ہیں یہ لوگ اپنی طرف کسی کو دیکھنے نہیں دیتے اور دوسروں کے گھروں میں نقب لگانا چاہتے ہیں تضاد کی کہانی ہے۔

"فوزیہ جس نے نامعلوم کیسے الفاظ منہ میں قید کر رکھے تھے, پھٹ پڑی۔۔۔
تمہیں معلوم ہے امتیاز کی بیوی کتنی مظلوم ہے ارے وہ کمینہ روز اس کو ٹارچر کرتا ہے نہ کہیں آنے جانے دیتا ہے نہ کسی سے ملنے دیتا ہے اور تو اور ایک اس کا کزن ہے بچاری کا جو نوکری کے سلسلے میں چھ مہینے ان کے گھر آکر رہا تھا اس پر اتنا شک کرتا ہے کہ حد نہیں؟۔۔۔ کہتا ہے کہ اگر کبھی اس سے بات کرتے دیکھا تو طلاق دے دوں گا۔ نہ خرچہ دیتا ہے نہ عزت۔۔۔ اور طلاق، طلاق کی دھمکی علیحدہ۔۔۔ اور خود سلای کر کے اپنے گزر اوقات کرتی ہے۔"(۳۴)

شہناز کی اس کہانی میں گہرا مشاہدہ موجود ہے یہاں لوگ دوسروں کی زندگیوں کو تباہ کر کے بھی پارسا نظر آتے ہیں جو کہ کھلا تضاد ہیں۔ ابھی فوزیہ نے محلے میں آنا جانا ہی شروع کیا تھا کہ محلے کے لوگ جمع ہو کر فوزیہ کی شکایت لے کر ان کے گھر پہنچ گئے۔ انہیں فوزیہ کے چلنے پھرنے، کھیلنے اور ٹی وی دیکھنے عرض ہر کام

پر اعتراض تھا اور محلے کے جمال صاحب جن کی دو بیویاں تھیں اور ان کا اپنی ایک بیوی کے سلوک اچھانہ تھا اس لیے اس نے جمال صاحب سے آکر طلاق کا مطالبہ کر دیا اور اس بات پر جمال صاحب فوزیہ کو الزام دیتے ہوئے اس کی برائیاں بیان کر رہے تھے۔ اور محلے والوں کی فوزیہ کا ڈش دیکھنا معیوب اور اسی گھر سے لیڈ لے کر اپنے گھر دیکھنا صحیح معلوم ہوتا ہے ایک ہنستا کھیلتا جوڑا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنے اور جھگڑنے لگتا ہے اور یہ باتیں روز معمول بن جاتی ہے اور اس جوڑے کی خوش مزاجی شگفتگی اور رونق ماند پڑ جاتی ہے۔ یہ دونوں ذہنی طور پر الگ ہوتے ہیں اور شوہر لوگوں کے بنائے ہوئے رسم ورواج پر اتفاق کر لیتا ہے مگر فوزیہ سمجھوتے اور مصلحتوں کو قبول نہیں کرتی اور دونوں کے درمیان " انا" کی دیوار آکھڑی ہوتی ہے اور یوں اس جوڑے کے درمیان پہلے جسمانی سطح اور پھر سماجی سطح پر علیحدگی ہو جاتی ہے اس کہانی میں فوزیہ کی باغیانہ سوچ اور سماج کے رجعت پسند لوگ ایک دوسرے سے متصادم نظر آتے ہیں۔

ب۔ اقدار

منہ دکھائی بے رونمائی

یہ کہانی ہے غریب گھر کی جہاں صائمہ نے جب سے آنکھ کھولی غربت کو دیکھا صائمہ سات بہن بھائی ہیں باپ بریانی کا ٹھیلا لگاتا ہے اور گلی کے نکڑ پر جمیل کی پان کی دکان ہے جہاں پر وہ فلمی گانے لگاتا ہے اور سکول سے آتی جاتی لڑکیاں ایسے دکانداروں کو ہی اپنا فلمی ہیرو سمجھنے لگتی ہیں ایسے میں صائمہ بھی جمیل سے پیار کرنے لگتی ہے اور اس کے سپنے دیکھتی ہے یکایک اس کے لئے ایک بہت امیر گھر سے رشتہ آتا ہے اور ایک لمبی گاڑی ان کے دروازے پر آتی ہے سب صائمہ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اب صائمہ کو بھی جمیل میں عیب دکھائی دیتے ہیں غربت سب سے بڑا عیب ہے محلے والے اور رشتہ دار سب صائمہ کی قسمت پر رشک تو کرتے ہیں لیکن کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ آخر ان رئیسوں کو اس گلی میں صائمہ ہی سے شادی کیوں کرنا ہے۔ یہ تو سب ان کی ظاہری شان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں صائمہ کی شادی سرمد سے ہو جاتی ہے اور اس پر سرمد کے نامرد ہونے کا عقدہ کھلتا ہے اور وہ زندگی کی حقیقت کو جان جاتی ہے کہ کیسے ان لوگوں نے اپنی ناک اور عزت اس زمانے میں رکھنے کے لیے بیٹی کا سودہ دولت سے کیا اس دنیا میں ہر عیب پیسے سے چھپ جاتا ہے اور اپنے امارت کے زور پر غریب کی بیٹی ناکردہ گناہ کی سزا ساری زندگی اٹھاتی ہے۔

یہ کیسا سماج ہے جہاں خود کی خامیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے غریب کی بیٹی کو ڈھال بنا کر استعمال کیا جاتا ہے۔ شہناز شورو نے اپنے افسانے کے ذریعے گویا خاموش زبان کو گویائی کی عطا کی ہے یہ افسانہ مزاحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو جھوٹی رسموں رواج کو نبھانے کے لیے غریب کا سودہ کرتے ہیں انہوں نے مرد کی" نامردی" بے نقاب کیا ہے اور اس ریاکار معاشرے میں نامکمل ہونے کا طعنہ صرف عورت ہی سہتی ہے اور اس کہانی کو عملی جامہ بھی عورت ہی پہناتی ہے اور ماں جو کہ خود بھی عورت ہے کسی کی بیٹی پر جانتے بوجھتے ظلم کرتی ہے اور اپنی بیٹی بیٹے کے عیب غریب کے آنچل سے چھپاتی ہیں یہ ہے اس معاشرے کا دوسرا رویہ۔

لہروں کی دھوپ

ہماری دم توڑتی اقدار کی کہانی ہے اس میں ایک لڑکی کومل کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا بیان ہے یہ سماج دولت کی تقسیم طبقات میں بٹے ہوئے لوگوں کا سماج ہے جہاں ہر کسی کی اچھائی اور برائی کو دولت سے ناپا جاتا ہے انسان کی حیثیت اس کے پیسے سے لگائی جاتی ہے اور انسانی جذبات اور احساس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اس افسانے کومل میں اور اشعر بچپن کے دوست ہیں اور ایک ساتھ کھیلتے ہیں لیکن کومل کے والد سیٹھ ہاشم بچوں کی دوستی کو بھی دولت ترازو میں تولتے ہیں بچپن معصوم ہوتا ہے اور بچوں کو ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا کس کے پاس کتنے پیسے ہیں اس سے سیٹھ ہاشم کی سوچ کا اندازہ ہوتا ہے۔

> " اسے یاد تھا ایک بار سیٹھ ہاشم نے محمودہ بیگم سے کہا تھا اسے سنبھالو نیچ لوگوں میں کھیلتی کودتی ہے بڑی ہوگی تو یہی بات الزام بن جائے گی کون نیچ لوگ؟ شاید بیگم محمودہ ہاشم کسی الجھن میں تھیں، وہی برہان علی اور اس کا بیٹا اشعر۔۔۔ کومل بستر میں دبکی سب سن رہی تھی کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا، وہ اشعر سے پوچھے گی کے، کیا تمہارے پاپا نیچ ہیں۔؟[۳۵]

برہان علی جب امیر ہو جاتے اور ان کے پاس دولت آجاتی ہے تب سے ہاشم کے لئے اشعر اب اشعر بیٹا بن جاتا ہے اور وہ اب چاہتے ہیں کہ کومل اور اشعر اکٹھے کھیلیں لیکن کومل کا معصوم ذہن اس تضاد کو نہ سمجھ سکا کہ کل تک جو نیچ تھا اب اتنا معتبر کیسے ہو گیا وہ ایک حساس لڑکی ہے جو زندگی کے واقعات کو محسوس کرتی ہے وہ اپنے ارد گرد پھیلی منافقت محسوس کرتی ہے لیکن اس کے احساسات کی کسی کو پروا نہی وہ ذہنی اور جذباتی آسودگی کی طلبگار ہے لیکن سیٹھ ہاشم جو ہر چیز کو اس کی قیمت سے پہچانتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"کئی بار سیٹھ ہاشم نے اپنی سرخ انگارہ آنکھیں اس پر گاڑ کر کہا تھا بد نصیب ہے یہ لڑکی منہ میں سونے کا نوالہ لے کر پیدا ہوئی ہے لوگ ترستے ہیں ایسی زندگی کے لیے سکون، اطمینان، روپیہ پیسہ کس چیز کی کمی ہے؟ قدرت نے ایک ہی اولاد دی اور وہ بھی ایسی ناشکری۔"(۳۶)

سیٹھ ہاشم کے نزدیک پیسہ ہی سب کچھ ہے وہ سمجھتے ہیں کہ پیسے سے سب کچھ حتی کہ حقیقی خوشی بھی خریدی جاسکتی ہے یہی زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہے اور زندگی کے لیے ضروری بھی لیکن ہر چیز کو پیسے کی نظر سے دیکھنا غلط رویہ ہے کومل کی ماں محمودہ بیگم بھی اس زندگی سے خوش نہیں ہیں وہ بظاہر تو خوش نظر آتی ہیں لیکن جذباتی اور ذہنی طور پر آسودہ نہیں ہیں وہ سیٹھ ہاشم کی پسند تھی اور سیٹھ ہاشم نے ان کو دولت کے بل پر حاصل تو کر لیا لیکن وہ ان کا دل نہ جیت سکے کومل اپنی ماں کی دل کی کیفیت اس اقتباس میں بیان کرتی ہے۔

"نوری کو جام تماچی کی دولت اور خزانوں کی ضرورت نہیں ہوتی جن لوگوں کے وجود دل سے خالی نہیں ہوتے انہیں یہ چمکتے سکے نہیں بھاتے انہیں اپنی مٹی اور پانی میں ہی راحت ملتی ہے جھوٹی خوشیاں جھوٹے جذبے سب کی حقیقت معلوم ہوتی ہے مگر حاکم نے کبھی مٹی کا پیار اور اپنائیت کو محسوس کیا ہو تو وہ جانے میری ماں کو بھی چاندی کی یہ دیواریں محبوس کیے ہوئے تھیں وہ اس وقت تک باہمت تھیں جب تک کہ میں اس کے پیروں کی زنجیر نہ تھی۔"(۳۷)

شہناز شورو اس افسانے میں یہ بات بتا رہی ہیں کہ بیسویں صدی میں جہاں بہت ترقی ہوئی ہے وہیں پر محبت اور معصومیت کو بھی بیچنے اور خریدنے کی شے بنا دیا یعنی جذبات اور احساسات کی کسی کو پروا نہیں ہے اس زمانے کی ڈگر کے خلاف مزاحمت صاف دکھائی دے رہی ہے زمانہ ترقی کر رہا ہے لیکن اس کے باوجود عورت بہت سے سماجی بندھنوں میں بندھی ہے اور اس کو معاشرتی دباؤ کا سامنا ہے ہے کومل بچپن سے احساس محرومی کے درد کو دل میں چھپائے بڑی ہو جاتی ہے وہ اس کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں ان سب سے پیچھا چھڑا کر وہ خوشی حاصل کرنا چاہتی ہے وہ خوشی جو کومل کو کشتی میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے چہرے میں دکھائی دیتی ہے اس لڑکی کی ایک بچی گھر نہیں ہے وہ کشتی میں رہتی ہے اپنے میاں بچی کے ساتھ لیکن اس کے چہرے کی خوشی اور اطمینان سے کومل مرغوب ہو جاتی ہے سچی خوشی دولت سے نہیں خریدی جاسکتی بلکہ عورت جب پاتی ہے جب

اس کے وجود کا اقرار اس کے جذبات اور احساسات کو سمجھا جائے اور اس کو بحثیت انسان قبول کیا جائے اس کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھا جائے۔

نورین رزاق اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

> "شہناز کی بیشتر کہانیاں عورت کے جذباتی ذہنی جنسی استحصال کے گرد گھومتی ہیں خارجی جبر اور گھٹن کی وجہ سے عورت کی داخلی و باطنی شکست وریخت اور اس کے نتیجے میں مٹتے، گلتے، سڑتے احساسات اور جذبات تعفن کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔"(۳۸)

وہم جو کلچر کی روایت کا حصہ ہوتا ہے

اس افسانے میں وہ فرسودہ روایات اور توہمات کا بہت خوبی سے بیان ہے جب ہم زندگی میں جب مسائل میں گھرتے ہیں تو ان معاملات کو عقلی اور شعوری طور پر حل کرنے کی بجائے ماورائیت سے اس کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اس کہانی کے دو کردار امتل اور فیضان دو بچے ہیں جو کہ بیمار ہیں اور ان کی بیماری بھی ایسی جو ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آتی بچے اچانک کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں ان کی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں سخت ہو کر اکڑ جاتے ہیں ان بچوں کے والدین عدیل اور طیبہ ہیں وہ اپنے بچوں کی بیماری سے بہت پریشان ہے وہ اپنے بچوں کے لئے ہر ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں لیکن ان کی بیماری کی تشخیص نہیں ہو پاتی تو اس پڑوس میں ملنے جلنے والے اور رشتہ دار سب ضعیف الاعتقادی کی باتیں کرتے ہیں اور ان کو ان کے حل بتاتے ہیں جیسے۔

> "کمروں کے باہر دروازے پر ایک پیاز الٹی کر کے لٹکا دی جائے۔ بری روحوں کا دم وہیں پر گھٹ جائے گا یا پھر شیشے کے مختلف رنگوں کے جار لے کر ان پر فلاں فلاں بزرگ سے دم کیا ہوا پانی ڈال کر گھر میں ہر جمعرات چھڑکاؤ کرنے سے تمام بیماریاں بھاگ جائے گی۔۔۔ دیواروں کے اطراف چینی ڈالی جائے تاکہ کیڑے مکوڑوں کے لئے رزق کا بندوبست ہو۔"(۳۹)

عدیل اور طیبہ یہ سب کچھ نہ چاہتے ہوئے بھی بچوں کی زندگی کے لئے سب کرتے ہیں لیکن بچوں کی حالت چند دن ٹھیک ہوتی ہے اور پھر وہی بیماری بچوں کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ لوگ عامل کو بھی گھر بلاتے ہیں اور اس کے کہنے پر گھر میں خرگوش اور طوطے بھی پالتے ہیں۔ انسان جب مسائل میں گھرتا ہے تو اس کی عقل بھی جواب دے جاتی ہیں اور اس معاشرے میں بسنے والے توہم پرستی کو ہوا دیتے ہیں اگر عطیہ اور عدیل کبھی

کسی کام کو کرنے میں خوش نہیں ہوتے تو بچوں کی دادی ان کو یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے اور پھر یہ دونوں ان کے ساتھ مل کر تمام کام سر انجام دیتے ہیں لیکن بچے ٹھیک نہیں ہوتے پیر وعامل کے پاس جاتے ہیں اور اس کو بھی نذرانے اور چڑھاوے کے نام پر پیسہ دیتے ہیں لیکن سب بے سود اور آخر کار ایک دن دونوں بچے وفات پا جاتے ہیں۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے میں موجود غلط روایات اور رسمیں ہیں اور وہ اعتقادات ہیں جو برسوں سے ہماری روایات کا حصہ ہے ہم جب بھی کوئی پریشانی آتی ہے تو ماروائیت سے اس کا حل تلاش کرتے ہیں یہ ہمارے برسوں پرانی روایات ہیں اور ہم آج بھی ان کو تھامے ہوئے ہیں۔

وہ

یہ افسانہ ایک لڑکی نادرہ کے احساسات اور جذبات کی ترجمانی ہے وہ ایک حساس لڑکی ہے اور سب سے محبت کرنے والی سب کی دوست بچپن میں ماں باپ سے پیار کے بدلے میں غصہ اور مار کھائی۔ اپنی محنت پڑھا ٹیوشن پڑھائی اور پھر بینک میں جاب ہو گئی وہ سب چہرے جو بچپن سے اس سے لڑتے جھگڑتے رہے اور اس کو ناپسند کرتے رہے اچانک بہت پیارے ہو گئے کیونکہ یہ سب کی ضرورت جو پوری کر رہی تھی سب کے لئے کچھ نہ کچھ خرید کر رہی تھی اماں کا علاج ابا کو حج بھائی کو پیسے اور بہن کو کمیٹی سب مل رہا تھا لیکن کسی کو اس کی شادی کی فکر نہ تھی۔ زندگی ایک ایسا شجر سایہ دار تھا جو دھوپ میں جلتا ہے لیکن دوسروں کو سایہ فراہم کرتا ہے خود جلتی رہی لیکن دوسروں کو آرام پہنچاتی رہی سب بہن بھائیوں کی شادی ہو گئی تھی اور سب اپنے گھروں میں آباد تھے صرف نادرہ تنہا تھی اس نے اپنے لئے ایک دو کمروں کا فلیٹ خریدا اور پھر وہاں شفٹ ہو گئی۔ اس اقتباس سے نادرہ کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

> "اب بچوں کو آنٹی کی ہمت اور بہادری کی کہانیاں سناتی کہ کیسے اس نے تعلیم مکمل کی۔۔۔ ٹیوشن پڑھائی، بسوں کے دھکے کھائیں، اپنا خرچہ اٹھایا، اپنی ذاتی قابلیت سے افسر بنی اور اب اپنے ذاتی فلیٹ میں کتنے مزے سے زندگی گزار رہی ہے وہ کتنی خوش ہوئی چاروں طرف تعریف ہو رہی تھی وہ کسی سے اپنا قرضہ واپس لینا نہیں چاہتی تھی۔ قرض ملنے کے بعد سے وہ پھر وہی بد چلن، مردوں سے دوستی رکھنے والی، آوارہ، فاخشہ اور کمینی بن جاتی اور یہ اسے منظور نہ تھا۔"(۴۰)

نادرہ کی زندگی میں کوئی خوشی نہ تھی وہ دوسروں کی مدد کر کے خوش ہوتی تھی ہے ایک وہ اپنی سالگرہ کا دن یاد رکھتی تھی اس دن اس کو اپنے ہونے کا احساس ہوتا تھا اس کو سہارے کی ضرورت تھی اس نے تین شادیاں کئیں لیکن تینوں بار ناکام رہی جو بھی ملا اپنے مفاد کے لئے اس سے شادی کی وہ اس سے پیسہ لینا چاہتے تھے اور اس کی خوشی کی کسی کو پرواہ نہ تھی۔ وہ ماں بننا چاہتی تھی اور مکمل ہونا چاہتی تھی لیکن اس کے کرب اور اس کی ذات کو سمجھنے والا کوئی نہ تھا وہ ماں نہ بن سکی اور ادھوری رہ گئی اور تیسری شادی کے ناکام ہونے کے بعد پھر اپنے فلیٹ میں لوٹ آئی۔ یہ دنیا مفاد پرستوں کی دنیا ہے یہاں جذبات و احساسات کی کوئی قدر نہیں دولت ہی سب کچھ ہے نادرا یہ سب کچھ سہتے سہتے اپنے حواس کھو بیٹھتی ہے اور افسانے کے آخری منظر میں نادرہ کی کیفیت کا بیان کچھ اس طرح ہے۔

" بائیں طرف کا دروازہ بند تھا نادرہ پاگلوں کی طرح اپنے کپڑے نوچ رہی تھی اور جسم کے اوپر والے حصے پر لپ سٹک لگا رہی تھی وہ یکدم پلٹا۔ " (۴۱)

نادرہ ماں بننا چاہتی تھی لیکن نہ بن سکی اور ممتا اس کے لاشعور میں بس چکی تھی یہ افسانہ ہمارے عہد کا جیتا جاگتا قصہ ہے کتنی ہی ایسی لڑکیاں ہمارے ارد گرد اپنی زندگی سسک سسک کر گزار رہی ہیں۔

نفسیاتی عدم توازن کا کرب

شہناز صاحبہ کا مشاہدہ بہت گہرا ہے ان کی نگاہیں زندگی کے کٹھن راستوں سے کہانیاں چنتی ہیں وہ زندگی کی تمام تلخ حقیقتیں دیکھ لیتی ہیں جو کہ عمومی نگاہیں نہیں دیکھ پاتیں نفسیاتی عدم توازن کا کرب بھی ایسی کہانی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اپنے اندر بہت سا کرب سمیٹے ہوئے ہے یہ شہناز کی کہانی ہے شہناز نے غریب گھرانے میں آنکھ کھولی ہے اس کا ایک بھائی اور چار بہنیں ہیں والدین کو بڑا ہوتے ہی ان کی شادی کی فکر لگ جاتی ہے ماں باپ میٹرک کرنے کے بعد ان کو پرائمری سکول میں استانیاں لگوا دیتے ہیں تاکہ یہ اپنا جہیز بنا سکیں یہ معاشرے کا المیہ ہے کہ بیٹیوں کے ان کے کھیلنے کودنے کے دن ہوتے ہیں کہ معاشرتی دباؤ ان کی شادیوں کے لیے ان کے ماں باپ پر بڑھ جاتا ہے وہ بھی اپنے سر سے اتارنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں بڑی بہن کی شادی کے بعد شہناز کی شادی بھی ہو جاتی ہے اس کا خاوند بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہے اور اپنی ماں سے بہت محبت کرتا ہے ہمارے معاشرے میں یہ عجیب روایت لوگوں کی بنائی ہیں کچھ لوگ صرف ماں باپ کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں اور بیوی کو بھول جاتے ہیں حالانکہ اسلام عدل کا درس دیتا ہے اور اپنے فرائض کو احسن طریقے

سے انجام دینے کا حکم دیتا ہے لیکن لوگ اپنے رشتوں اور فرائض میں اعتدال سے کام نہیں لیتے یہی کچھ اس کہانی میں دیکھنے کو ملتا ہے کہ کیسے شہناز کا میاں کبھی اس کے کمرے میں نہیں آتا اور سوتا بھی ماں کے پاس ہے وہ جاب کے ساتھ گھر کا کام بھی کرتی ہے لیکن شوہر کی محبت نہ پا سکی اور احساس تنہائی نے اس کو چڑچڑا بنا دیا۔

"کیا کرنے آتے ہو میرے کمرے میں۔۔۔اس کی آواز اونچی ہو گئی ک
ک کچھ نہی کمزور مرد کی بری نیت ہوا بن کہ اڑ گئی تو پھر جا۔۔ جا کر سو ماں
کے پاس اُٹھا یہ بدبو گھاٹ یہاں سے مجھے نہی ضرورت تیری۔"(۴۲)

شہناز شورو اس کہانی میں ازدواجی زندگی کے اس روپ سے آشنائی دیتی ہیں کہ کیسے کمزور مرد کے ساتھ عورت خود کو تنہا محسوس کرتی ہے بانو قدسیہ نے "راجہ گدھ" میں ایسے ہی ماں بیٹے کے رشتے کو قلم بند کیا تھا ان کی ہیروین اپنا دکھ بیان کرتی ہے۔

"اچھا ہے جو میں مر جاوں پہلے۔۔۔یہ عاشقی ماشوقی جو ماں بیٹے میں چلتی ہے
اس سے تو چھٹی ملے رج رج کے جھپیاں ڈالیں ایک دوسرے کو"(۴۳)

اس کہانی میں عورت کی ناآسودہ زندگی کی جنسی و جذباتی زندگی کا بیان ہے اور شوہر غیر فعال اور سست ہے اور کردار کے نفسیاتی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ OedIpus Complex کا شکار ہے۔

فرائیڈ OedIpus Complex کے بارے میں کہتے ہیں:

"بچہ پوری طرح ماں کو اپنی دسترس میں رکھنا چاہتا ہے اور اپنے باپ
کے سلسلے میں حریفانہ جذبات کا حامل ہوتا ہے اسی کو OedIpus
Complex کہتے ہیں۔"(۴۴)

کاروکاری

شہناز شورو کا تعلق اندرون سندھ سے ہے۔ جاگیر داری نظام پر ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے کاروکاری ہمارے سماج کی کہانی ہے جہاں عورت کبھی جائیداد کی وجہ سے کبھی غیرت کے نام پر قتل کر دی جاتی ہے کاروکاری جہالت کی کہانی ہے کاروباری کی کہانی مراد کی کہانی ہے مراد آوارہ اور نکما نوجوان ہے زرینہ مراد کی کی منگیتر ہے زرینہ کے والدین مراد کی بد چلنی کی وجہ سے زرینہ کا رشتہ ایک ماسٹر سے کر دیتے ہیں جس کا نام

تاجل ہے وہ ایک شریف انسان۔ مراد کے ماں باپ نے بیٹے کو کو برا سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مراد آوارہ، بد چلن ہے لیکن مراد یہ بات نہیں سمجھتا بلکہ غصہ کرتا ہے

" مراد اگر تیرے لچھن اچھے ہوتے تو تیرے گھر شہنائی اترتی اورآج زرینہ تیری ہوتی کیا بولا میرے لچھن برے ہیں اس کمینے تاجل کے لچھن سدھرے ہوئے ہیں؟اس کی کیا اوقات میرے سامنے جب چاہوں دماغ درست کر دوں آج وڈیرے کو بولوں تو اس کے پورے خاندان کو الٹا لٹکا دے "(۴۵)

ان باتوں سے مراد کی کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی میں کا اندازہ بخوبی ہو رہا ہے۔ اس کہانی میں وڈیرہ بھی ایک اہم کردار ہے جو لوگوں کو غیرت کے نام پر قتل کرنے کو کہتا ہے اس کہانی میں ہر طرف سے مراد کو نامرد کہہ کر بلاتے ہیں اور اس کو بدلہ لینے پر اکساتے ہیں مراد کو ان لوگوں کی مثال دی جاتی ہے جو پہلے غیرت کے نام پر پر قتل کر چکے ہیں۔ ان باتوں سے مراد کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

" مراد کے لئے دعاؤں تنگ ہو گیا تاجل اور کرینہ کی شادی کیا ہوئی لوگوں کی آنکھوں اور زبانوں پر پر اس کی نامردی کہ طعنے۔ اتر آئے اونہہ بڑا بنا پھرتا تھا بدمعاش۔۔۔ کیا کر سکا؟ سوچ سوچ کر اس کا ذھن پھٹنے لگتا۔ کبھی سوچتا آدھے گاوں کا قتل کر ڈالے۔ (۴۶)

شہناز صاحبہ کاروکاری کے مسائل اور گھناونے قتل کا پول کھولتی ہیں کہ کیسے یہ معاشرہ انسان کا قتل اتنی آسانی سے کر کے اس کو غیرت کا نام دے دیتے ہیں پھر یا تو پکڑے نہی جاتے اگر گرفتار ہو بھی جائیں تو جلد چھوٹ کر دندناتے پھرتے ہیں۔ اس تمام معاملے میں وڈیرہ بھی اہم کردار ہے جو لوگوں کی زندگیوں کے فیصلے اپنے اوطاق میں بیٹھ کر کرتے ہیں۔ اس افسانے میں وڈیرہ مراد کو اپنے ڈیرے پر بلاتا ہے۔ مراد اور وڈیرے کا مکالمہ دیکھئے

" بھول گئے اپنی منگ کو وڈیرے نے اپنی دائیں ٹانگ بائیں ٹانگ پر جماتے ہوئے کہا۔ نہیں وڈیرہ سائیں۔۔۔ مراد نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر کو جھکا دیا۔۔ اور بدنامی؟ کیسے بھول سکتا ہوں سرکار۔ تیری چپ تو کچھ اور بتا رہی ہے۔ سوچ رہا تھا سائیں باشاہ۔ اچھا تو سوچنے والوں کے پاس غیرت ہوتی ہے کیا؟۔ "(۴۷)

اس مکالمے میں کو پڑھ کر وڈیرے کی سوچ کا اندازہ ہوتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ سوچنے والوں میں غیرت ہوتی ہے کیا یہ ایک اہم بات ہے جس کا ذکر شہناز صاحبہ نے کیا یعنی سوچ فکر اور شعور کا نہ ہونا یعنی یہ جاگیر دار اور وڈیرے عوام کو شعور اور علم کی راہ پر جانے سے یہ کہہ کر روک دیتے ہیں کہ علم حاصل کر کے تم بے غیرت ہو جاؤ گے یہ علم سے دور رکھنے کا ایک بہانہ ہے تا کہ کہ ان کی دکان چلتی رہے۔ آگے چل کر وڈیرہ مراد کو قتل کرنے پر اکساتا ہے۔ درج زیل مکالمے میں کاروکاری کے پیچھے جو ذھنیت ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے

"اور ماسٹر کے ساتھ کون جائے گا؟ وڈیرے نے ذو معنی انداز میں پوچھا۔ کتنی بہنیں ہیں تیری؟ ایک سائیں۔ مراد کا سر جھک گیا۔ ہوں کوئی بھابی۔ نہیں سرکار۔ کوئی رشتہ دار یا سنگتیانی یار وغیرہ وڈیرے نے دایئں آنکھ دباتے ہوئے پوچھا"(۴۸)

کاروکاری میں جس کو قتل کرنا ہوتا ہے اس کے ساتھ عورت کو ناحق الزام لگا کر قتل کر دیا جاتا ہے وہ انجانے میں تحمت لیکر رنیا سے چلی جاتی ہے۔ اس افسانے میں مراد تاجل کے ساتھ اپنی معصوم بہن کا قتل کرتا ہے اور وڈیرہ اس قتل پر اس کا سارا قرضہ معاف کر دیتا ہے اور قید سے بھی چھڑا لیتا ہے۔ کیسے ہیں یہ لوگ جو اپنی جھوٹی اناوں کی خاطر معاشرے میں غیرت کے نام پر معصوموں کا قتل کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مسز فرخ جاوید "عمرانیات "نیشنل بک فاؤنڈیشن۱۹۷۸ء، ص ۷۳

۲۔ انور سعید، ڈاکٹر، (تدوین)"ثقافتی انسانیت" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۷۸ء، ص ۲۳

۳۔ ایضاً، ص ۱۸

۴۔ سبط حسن "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون، ۱۹۸۹ء ص ۲۳

۵۔ مسز فرخ جاوید "عمرانیات" نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۱۹۷۹ء، ص ۷۴

۶۔ ایضاً، ص ۷۵

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر "ثقافتی انسانیت" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور ۱۹۷۸ء، ص ۲۳

۸۔ مظہر حسین، ڈاکٹر "اقبال اور ثقافت" اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۴ء، ص ۲۰

۹۔ سبط حسن "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ کراچی ۱۹۸۹ء، ص ۱۶ 10:50 pm

۱۰۔ لیاقت جتوئی" پاکستان میں مختلف ثقافتوں کی رنگ" www Jung.com.pk، ۱۴ اگست ۲۰۱۹ء 11:20am

۱۱۔ مظہر حسین، ڈاکٹر "اقبال اور ثقافت" اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۷۹ء، ص ۱۹

۱۲۔ شیاما چرن دوبے "سماج سناشی" نیشنل کونسل آف ایجو کیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ نئی دہلی ۱۹۷۸ء، ص ۳۹

۱۳۔ شیاما چرن دوبے "سماجی سناشی"، ص ۳۹

۱۴۔ سبط حسن "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ کراچی ۱۹۷۷ء، ص ۵۱

۱۵۔ حنا رضوی، ڈاکٹر" برصغیر اور اس کے رسم و رواج" http://urduqasid.sc، ۲۳ جنوری ۲۰۲۱ء 10:20am

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ مسز فرخ جاوید "عمرانیات" نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد پاکستان، ص ۱۴۰

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ جمیل خان "زوال دکھ" مضمون مشمولہ، سلسلہ، پبلی کیشنز گلشن اقبال کراچی، فروری ۲۰۱۸ء، ص ۵۷

۲۰۔ فطرت اور روایت "زوال دکھ"، ص ۳۸

۲۱۔ ایضاً، ص۳۹

۲۲۔ ایضاً، ص۴۰

۲۳۔ پہلا کمرہ تیسری عورت "لوگ لفظ اور انا"، ص۱۸۹

۲۴۔ ایضاً، ص۱۹۰

۲۵۔ ایضاً، ص۱۹۱

۲۶۔ انور احمد، ڈاکٹر "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ" مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ص۶۰۰

۲۷۔ بازیافت "لوگ لفظ اور انا"، ص۱۳۴

۲۸۔ ایضاً، ص۱۳۵

۲۹۔ ایضاً، ص۱۳۶

۳۰۔ ایضاً۔ ص۱۳۷

۳۱۔ طاہر، اقبال "زوال دکھ" مضمون مشمولہ، کتابی سلسلہ، پبلی کیشنز کراچی، ص۳۸

۳۲۔ حویلی "زوال دکھ"، ص۲۰۴

۳۳۔ عذرا اصغر "شہناز شورو اور اُن کے افسانے" مضمون مشمولہ، سلسلہ، پبلی کیشنز کراچی، ص۳۸

۳۴۔ لوگ لفظ اور انا "زوال دکھ"، ص۲۰۴

۳۵۔ ایضاً، ص۲۰۵

۳۶۔ لہروں کی دھوپ "لوگ لفظ اور انا"، ص۱۲۴

۳۷۔ ایضاً، ص۱۲۵

۳۸۔ ایضاً۔ ص۱۲۶

۳۹۔ نورین رزاق "شہناز شورو کے افسانوں میں نسائی احساس"، مضمون مشمولہ، سلسلہ، پبلی کیشنز کراچی، ص۲۶

۴۰۔ وہم جو کلچر کی روایت کا حصّہ ہوتا ہے، "زوال دکھ"، ص۱۷۹

۴۱۔ وہ "لوگ لفظ اور انا"، ص۱۵۹

۴۲۔ ایضاً۔ ص۱۶۰

۴۳۔ نفسیاتی عدم توازن کا کرب "زوال دکھ"، ص۲۹

۴۴۔ ایضاً، ص ۳۰

۴۵۔ شہزاد احمد "فرائیڈ کی نفسیات دو دور"، سنگ میل پبلیکشنز لاہور ۱۹۹۴، ص ۱۸۰

۴۶۔ کاروکاری "زوال دکھ"، ص ۱۵۱

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۵۳

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۵۴

باب چہارم

مجموعی جائزہ

الف۔ مجموعی جائزہ

مزاحمت ایسے عمل کا نام ہے جو پہلے سے موجود کسی نظام تحریک کے خلاف ہو یعنی مزاحمت رد عمل ہے کسی عمل کا انسانی زندگی میں مداخلت پسند نہیں کرتا مزاحمت اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی خواہش کا اظہار ہے انسان اس دنیا میں آنے کے بعد سے ہی اپنے جینے کی جدوجہد کے لئے موسمی حالات سب سے ہی نبرد آزما ہوا ہے فرد کو اپنی زندگی میں بہت سے جبر کا سامنا رہتا ہے اور جبر تین صورتوں انسان کے سامنے آتا ہے ایک صورت پیش آتی ہے جب کوئی بیرونی طاقت حملہ آور ہو یہ حملہ چار دیواری یا وطن پر ہو سکتا ہے دوسری صورت رہائشی جبر ہے بادشاہی دور میں یہ میں ہر علاقہ جبر کا شکار رہا ہے اس دور میں عوام غلام اور دریا کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں انسانی حقوق کے ساتھ ساتھ معاشی اور سیاسی آزادی سلب ہو جاتی ہے اور تیسری صورت میں سماج اندرونی طور پر سماجی و سیاسی نظام کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے مزاحمت کا عمل دفاعی عمل ہے اور جب خارج سے کسی فرد اور معاشرے پر اثر انداز ہو تو مزاحمت ہوتی ہے انسان اپنے ماحول کا عادی ہو جاتا ہے اس کو اپنے اشیاء نظریات اور عقائد سے بہت پیار ہوتا ہے اگر کوئی ان کو بدلنے کی کوشش کرے تو وہ مزاحمت کرتا ہے و مزاحمت دو طرح سے ہوتی ہے ایک انفرادی اور دوسری صورت اجتماعی مزاحمت کی ہے اجتماعی مزاحمت بھی انفرادی مزاحمت سے ہی شروع ہوتی ہے جب تک کوئی شخص آپ کے اندر کسی عمل کے خلاف غم و غصّے اور نفرت کے جذبات نہ محسوس کرے تب تک اجتماعی نہیں ہوتی ہے اجتماعی مزاحمت کو تحریک بھی کہا جاتا ہے اس میں بہت سے افراد مل کر مزاحمت کرتے ہیں تمام افراد کے مفادات مشترکہ ہوں آپس میں اتحاد ہو اور اس چیز کو محسوس کریں گی یہ ناانصافی سب ہی کے خلاف ہے اس میں کسی ایک فرد کا کردار اہم ہوتا ہے جس کو باقی لوگ رہنما یا لیڈر کے طور پر قبول کرتے ہیں بہت سی اجتماعی مزاحمت کی مثال ملتی ہیں۔ مزاحمت سے زندگی میں تبدیلی آتی ہے اگر مزاحمت نہ ہو تو زندگی جمود کا شکار ہو جاتی ہے تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاشرے جو وقت کے ساتھ اپنی روایات و اقدار میں تبدیلی نہیں لائے وہ مٹ گئے جو فرد معاشرے میں کسی بات یہ واقعہ پر رد عمل دیتا ہے اس کو مزاحم کہا جاتا ہے دراصل یہ مزاحم ہی تبدیلی کا سبب بنتے ہیں معاشرے میں ایک طبقہ اپنے سے کم یا پست طبقہ کا استحصال کرتا ہے استحصال سیاسی سماجی مذہبی

یا معاشرتی طور پر کیا جاتا ہے مزاحمت کو زیادہ تر نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی تناظر میں دیکھا جاتا ہے کیوں کی ترقی پذیر اور مابعد نو آبادیاتی ممالک میں سماجی اقدار کمزور ہو جاتی ہے لوگ گروہوں اور طبقات میں بٹ جاتے ہیں ایسے ماحول میں مزاحمت فروغ پاتی ہے۔ مزاحمت انسان کے اندر کی آواز ہے ہر باشعور انسان اپنے اور اپنے ارد گرد ہونے والی زیادتیوں کو محسوس کرتا ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتا لیکن ایک ادیب اپنے احساسات کو کاغذ پر منتقل کرتا ہے اور یہ الفاظ اس کے احساسات کا عکس ہوتے ہیں مزاحمت گھٹن زدہ ماحول کی پیداوار ہے ادب تخلیق کرنا ہی مزاحمت کرنا ہے۔ کیوں کہ ادیب اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھتا ہے اور مسائل کو محسوس کرتا ہے اور اس کشمکش اور بے چینی کو اپنی تحریر میں جگہ دیتا ہے سماج میں کبھی طبقاتی نظام کبھی سماجی ناہمواری کی وجہ سے لوگوں کا استحصال ہوتا ہے اور لوگ رد عمل کے ذریعے مزاحمت کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد مختلف ادوار میں مارشل لاء لگا اور آمرانہ رویوں کے خلاف ملک میں مزاحمت کی فضا قائم ہوئی ادب میں زبردستی نہیں ہے اور ادیب پر کوئی فکر یہ نظریہ زبردستی نہیں منوایا جاسکتا ہمیں اردو شاعری میں غزل میں قافیہ ردیف کے خلاف مزاحمت سے پابند نظم اور پابند نظم سے آزاد نظم تخلیق ہوئی۔

مزاحمت میں بنیادی طور پر دو پہلو نمایاں ہیں خارجی مزاحمت و داخلی مزاحمت۔ داخلی مزاحمت انسانی ذہن اور سوچ سے تعلق رکھتی ہے اور یہ سوچ معاشرے میں بدلتے ہوئے حالات کی پیداوار ہوتی ہے اندر کی گھٹن اضطراب ہی خارجی مزاحمت کا سبب بنتے ہیں خارجی مزاحمت عملی مزاحمت ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں جیسے مکمل خاموشی مار پیٹ چیخ و پکار تقریر کرنا یا کبھی قطع تعلق کر لینا وہ ایسا کرنے سے اپنا کتھارسز چاہتا ہے کیونکہ انسان اپنے طور پر خیالات کا اظہار چاہتا ہے اور اس کا بہترین اور موثر ذریعہ ادب ہے ہر ادیب اور شاعر نے اپنے ماحول میں ہونے والے واقعات کو قلم بند کیا اور یہی واقعات شاعر اپنی شاعری میں بیان کرتا ہے اور معاشرے کے مسائل اور موضوعات ہی ان کی تخلیق کا موضوع ہوتے ہیں ترقی پسند تحریک میں لکھے جانے والے ادب کا موضوع ہی انسان اور سماج ہیں۔ اور مزاحمت ہمارے ادب میں بسی ہے جب اردو ادب کا آغاز ہوا وہ سیاسی تہذیبی اور معاشی زوال کا دور تھا یہ مسلمانوں کے ساڑھے چھ سو سالہ اقتدار کا خاتمہ اور غلامی کا دور تھا ۱۸۵۷ء کے بعد کے ایسی فضا قائم ہوئی صاحب اقتدار لوگ ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ ذہنی اور فکری سطح پر بھی محتاج ہو گئے۔ اس صورت حال نے تمام سیاسی معاشی اور ثقافتی عناصر کو متاثر کیا اور ان اثرات کو وہ اس وقت ادبا و شعرا کی تخلیقات میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

سودا، ناجی ،حاتم اور کئی دوسرے شعرا نے شہر آشوب لکھی میر کے دل کی تباہی شہر کی تباہی ہے غالب کے ہاں برباد چمن اور اجڑی ہوئی تہذیب کی تصویر ہے۔اس وقت برصغیر کے مسلمان تین حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے ایک نئی حکومت سے مفاہمت نہیں چاہتے تھے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء عرصے میں یاسیت۔ آہ وبکا کا رجحان اور دوسرا رجحان دبستان سرسید اور ان کے رفقاء کے حوالے سے سامنے آیا آج انجمن پنجاب کا معاون تھا بیسویں صدی کے درمیان اردو میں انقلابی رویہ روشناس ہوا اس دور میں سرشار نے طنزیہ اور اکبر آبادی نے طنز وظرافت کے ذریعے اس دور کی عکاسی کی بیسویں صدی کے شروع میں نو آبادیاتی نظام عروج پر تھا اور سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے مسلمانوں کی بیداری کے لئے بہت کام کیا اقبال کی شاعری نے نوجوانوں میں جدوجہد اور جوش کو ابھارا اقبال کے بعد چکبست نے اردو شاعری کو ایک نیا ذائقہ دیا چکبست کی شاعری میں حب الوطنی تاریخی واقعات اور مذہبی عقائد کے انکشافات موجود ہیں رومانوی شاعری میں "اختر شیرانی "،"عظمت اللہ"،"حفیظ "، اور "حامد اللہ "افسر شامل ہے بیسویں صدی ہی میں ترقی پسند تحریک نے سوچ کا دھارا بدلا۔ اردو افسانے میں انگارے نے جرات اظہار کو جنم دیا اور ترقی پسند تحریک کو بڑھاوا ملا اس تحریک نے چوٹی کے ادیب اور اعلی ادب تخلیق کیا اور معاشی وسماجی ناہمواریوں کے خلاف ضمیر کو جنجھوڑا تو دوسری طرف آزادی کی تحریک میں حصہ لیا اس تحریک کی بدولت عوام کو مل جل کر جدوجہد کرنے کا شعور ملا ۱۹۳۱ء میں حلقہ ارباب ذوق کی ابتدا ہوئی اور ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق نے نئے مباحث کو جنم دیا۔

بیسویں صدی اپنے اختتام پر جن مسائل کا شکار ہوئیں وہ جنگ عظیم اول دوم اور انقلاب روسی کی وجوہات تھیں اس صدی میں بہت سے بڑے نام پیدا ہوئے جنہوں نے نظم غزل کو نئی فکر اسالیب اور فنی رویے دیئے ان اہم ناموں میں حسرت موہانی، فانی، بیگانہ، جگر مرادآبادی، میراجی ،نون میم راشد، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، وزیر آغا، اختر شیرانی، اور فیض احمد فیض شامل ہیں آغاز کے بعد سیاسی خوف جبر تشدد کی فضا کا تسلسل بیسویں صدی میں بھی جاری رہا یہ مختلف صورتوں میں مزاحمت احتجاج مزاحمت ہماری شاعری میں موجود رہی اور قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہیں کیونکہ آزادی کے بعد وہ کچھ نہ ملا یہ جس کی توقع میں آزادی حاصل کی تھی۔

اردو میں مختصر افسانہ انگریزی ادب سے آیا ہے اور اس کو موسپاں اور چیخوف نے فن کا درجہ دیا اردو میں افسانے کا رشتہ قدیم کہانی کی روایت سے ملتا ہے۔ اور جب اردو صحافت فروغ پا رہی تھی اس لئے انگریزی

تراجم کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو افسانے کو بھی ترقی ملی مزاحمت اور احتجاج کے تمام رنگ زمین سے جڑے ہیں۔

اسے اپنے افسانوں میں احتجاج کی فضا قائم کیے اور سوز وطن میں جو درد پنہاں تھا اس نے افسانے میں ایک نئی روح پیدا کی۔ قیام پاکستان وطن کی جدائی کے ساتھ عمل میں آیا اور مذہبی جبر نے بہت سا مواد فراہم کیا اور اس وجہ سے بہترین افسانے لکھے گئے ان میں مزاحمتی رویہ احتجاج و انقلاب بغاوت کا مزاج موجود تھا منٹو انقلابی و باغی ادیب تھا اور منٹو نے افسانوں کو نئی معنویت دی اور فسادات پر بہت سے افسانے لکھے گئے اور تقسیم کے بعد کرشن چندر بیدی، عصمت چغتائی، پریم چند کور، عزیز احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب اور منٹو کے افسانوں میں احتجاج نمایاں تھا۔

جدیدیت سے پہلے اردو افسانے میں مزاحمت و احتجاج کے واضح نقش موجود تھے۔ انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر کے ہاں ماضی کے بازیافت موجود ہیں۔ انہوں نے اساطیر سے کام لیا انتظار حسین کا زرد کتا اور قرۃ العین حیدر کا کیکٹس اس کی مثال ہے۔ جدیدیت کے دور کے نمایاں افسانہ نگاروں میں بلراج، سریندر پرکاش اور احمد ہمیش شامل ہیں ان میں ترقی پسند کی فکر والے بھی ہیں اور جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر لکھنے والے بھی موجود ہیں۔ اکیسویں صدی میں افسانوی ادب میں نئے موضوعات ورجحانات شامل ہو رہے ہیں۔

فرد سے معاشرہ اور معاشرے سے پوری دنیا ادب کا موضوع ہے اور کہانی کا کینوس تمام براعظموں تک پھیلا ہوا ہے۔ انتظار حسین، نیر مسعود، عبداللہ، عابد سہیل مستنصر حسین تارڑ، بانو قدسیہ، ترنم ریاض، نسیم حجازی، رشید امجد بلراج بخشی، اے حمید، احمد ندیم قاسمی، رضیہ بٹ، انیس ناگی، شوکت صدیقی، بہت سے لکھنے والوں نے فکشن کی حیثیت کو بدلنے کی شعوری کوشش کی اب اردو افسانہ ایک نئی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔

جب سے دنیا وجود میں آئی ہے ہم عورت کو حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے پایا۔ چاہے انسان کے پیدا کردہ مشکلات ہو یا قدرتی آفات انہوں نے اجتماعی و انفرادی دونوں کی مزاحمت کی۔ خواتین مختلف ادوار میں مختلف تحریکیں چلائیں۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس نے ۱۹۲۷ء میں کم عمری کی شادی کا مطالبہ کیا اور مدارس اسمبلی سے منظور بھی کرایا ہر دور حکومت نے مردوں اور عورتوں کو طلاق کے معاملے میں یکساں حقوق دیے ہندوستان میں خواتین تنظیموں نے جائیداد اور وراثت کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی اور ہندو کوڈ کے خاطر ظالمانہ قوانین کے خاتمے کے لیے کوششیں کئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر قومی آزادی کی تحریک

چلی اور مختلف ممالک کی خواتین نے حق خودرادیت کی تحریکوں میں حصہ لیا۔ پاکستان کی آزادی میں خواتین بہت اہم کردار نبھایا۔ صغرا بی بی جو چودہ برس کی تھی سیکرٹریٹ کی عمارت میں مسلم لیگ کا پرچم لہرایا فلسطینی خواتین نے بھی اسرائیل کے ظلم اور تشدد کے خلاف کارہائے نمایاں انجام دیے اس قسم کی تحریکوں سے خواتین کو گھر سے باہر نکلنے کے مواقع ملتے ہیں اپنے شعور سے آگاہی ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ عورت نے انفرادی طور پر بھی مزاحمت کی اور اس کی بہت سی مثالیں تاریخ کے اوراق پلٹنے پر ملتی ہیں مغربی دانشوروں کے مطابق مزاحمت کی تحریک کا آغاز میری وال اسٹون کرافٹ کی تصنیف سے ہوا۔ یہ کتاب ۱۹۸۲ء شائع ہوئی اس وقت اس کی باتیں جدت پسندانہ تھیں اور بڑی بے باکی سے لکھی گئی تھی اس تحریک کے دوسرے علمبردار سمیون دلی بوار نے اپنی کتاب the second sex میں باغیانہ اور منفرد انداز میں تحریر کیا اس سلسلے کی تیسری کتاب ورجینا وولف نے A room of noes own. کے نام سے لکھی اس میں عورت کی آزادی اظہار کی بات کی ورجینا وولف کی کتاب کون انسانی جدوجہد کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔ اردو ادب میں ابتدائی دور میں خواتین جو ادب تحریر کیا اس میں زیادہ تر رومانوی تقلیدی اور اصلاحی تھا۔ پھر وقت نے کروٹ لی اور خواتین کے عہد کے تقاضے اور تغیرات کو محسوس کیا اور اردو ادب کی روش کا ساتھ دیا انہوں نے فکر کے ساتھ فنی اعتبار سے بھی ہر تبدیلی کو قبول کیا۔ اور اس وقت ترقی پسند تحریک ایک نئے موڑ کے طور پر سامنے آئی۔ خواتین نے اردو افسانے کو انسانی تجربات سے آشنا کرایا اور وسعت دی ہے ۱۹۸۰ء کے بعد ہمیں مزاحمت و احساس کی شدت زیادہ دکھائی دیتی ہے اس کے علاوہ اظہار کی جرات اسالیب کا تنوع اور فن کے روشن نشان بھی ملتے ہیں جدید خواتین افسانہ نگاروں کی تحریروں میں ہمیں احتجاج کا لہجہ تیز ہوتا دکھائی دیتا ہے ان کے ہاں عورت وفا کی دیوی کی بجائے ایک نئے انداز میں اپنے وجود کے احساس کے ساتھ نظر آتی ہے۔ افسانہ نگار غزالہ ضخیم اپنے افسانوں میں مردہ سوچ کے خلاف احتجاج کرتی ہے رخسانہ صدیقی ایک نیا نام ہے ان کا افسانہ "سائبان" میں کردار امینہ کا اارویہ اور لہجہ اس کی قوت بغاوت اور احتجاج ہے شہناز شورو سندھ کے علاقے میرپور خاص میں پیدا ہوئیں ان کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے ہے گھر کی فضا ادبی تھی ماموں شاعر اور والدہ ادبی مجلے اور ڈائجسٹ پڑھا کرتی تھیں انہوں نے جامشورو یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا ۲۰۰۶ء میں برطانیہ چلی گئیں ان کی شادی اکبر لغاری سے ہوئی ان کے دو بچے ہیں اور آج کل کینیڈا میں مقیم ہیں شہناز شورو حساس طبیعت کی مالک ہیں اور ارد گرد کے واقعات کا اثر لیتی اور اپنی تحریروں میں جگہ دیتی ہے انہوں نے افسانہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ماہنامہ "صریر" سے کیا ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "لوگ لفظ اور آنا " اور دوسرا افسانوی

مجموعہ "زوال دکھ" کے عنوان سے ہے یہ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ کالم نگاری اور ترجمہ بھی کرتی ہیں۔ سندھی زبان کے دانشور حیدر علی لغاری کے مضامین جو شاہ عبدل لطیف پر لکھے گئے ان کا اردو ترجمہ کیا مرزا قلیج بیگ کی سوانح عمری کا بھی اردو ترجمہ کیا ان کا پہلا افسانہ "لہروں کی دھوپ" ماہنامہ صریر میں شائع ہوا۔

انسان جب زمین پر آیا تو سب سے پہلے اس کو بھوک نے ستایا اور اس نے درختوں کے پتے کھا کر بھوک کو مٹایا۔ اور جب موسم کی سختی نے ستایا تو پتوں سے اپنے تن کو ڈھانپا رفتہ رفتہ انسان اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے دوسرے انسانوں کے قریب ہوتا گیا اور اس طرح ایک دوسرے سے ہمدردی ہو پیدا ہوئی اور ایک دوسرے کی ضروریات پوری ہونے لگئیں اور اس طرح بستیاں بسیں اور انسان گروہ کی صورت میں رہنے لگا اور رفتہ رفتہ خاندان بننے لگے۔ انسان نے اپنی بنیادی ضروریات زندگی اور زندگی کو محفوظ بنانے اور خطروں سے نمبرد آزما ہونے کے لئے سماج بنایا سماج ہی فرد کی پہچان ہے اور فرد ہی کی بدولت انسان ہے۔ ماہرین کے نظریات کو دیکھتے ہوئے سماج ایسا گروہ جس میں فرد کا افراد سے رشتہ ہے اور وہ ایک دوسرے پر اپنی ضروریات کے لئے ان انحصار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ہمدردی اور قربت کے رشتے بنتے ہیں اور رشتوں کا بندھن میں سماج کی خوبصورتی ہے۔ سماج میں رہتے ہوئے فرد چھوٹوں سے پیار اور بڑوں کا احترام اور گھر والوں کی ضروریات کا خیال رکھنا سیکھتا ہے۔ یہ سماج میں رہنے کے لئے ان قدروں کا قائم رہنا ضروری ہے یہ قدریں رفتہ رفتہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ اور سماج کی پہچان بن جاتی ہے اور پھر سماج میں رہنے والے افراد پر کچھ ذمہ داریاں اور کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ ان حقوق و فرائض سے ایک صحت مند معاشرہ کا وجود ہے انسانی سوچ رویے نظریات اور رجحانات ایک معاشرے میں تبدیلی لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ سماج میں اگر تبدیلی نہ ہو تو سماج جمود کا شکار ہو جاتے ہیں سماج میں تبدیلی کا عمل بہت آہستہ ہوتا ہے لیکن یہ سماج کی بقا کے لیے بہت ضروری ہے انسان کی فطری ضروریات کو ایک سماجی یا گروہی پورا کر سکتا ہے۔ قدیم سماج میں بسنے والوں کی زندگی آج کے سماج میں بسنے والوں کی زندگیوں سے مختلف ہیں قدیم سماج کا انسان بہت مشکل حالات میں زندگی بسر کرتا تھا لیکن آج کا انسان اپنی زندگیوں کو عقل و شعور کی روشنی میں آرام دہ بنا چکا ہے اور اس کو وہ آسائش میسر ہیں جن کا قدیم سماج میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انسان سماج میں رہتے ہوئے اپنی انفرادی طور پر پہچان چاہتا ہے اور یہ پہچان اپنی قابلیت کی بنا پر حاصل کرتا ہے منظم سماجی زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ انسانی جان کا تحفظ ہو یعنی نئی نسل پرانی نسل کی جگہ لے لی۔ اتفاق رائے ہو اور سماج میں امن کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی تخریبی طبیعت کو کنٹرول کیا جائے اور اس کی طبیعت کو تعمیری بنایا

جائے اور سماج میں ایک پیداواری نظام ہونا بہت ضروری ہے تاکہ سماج بہتر طور پر اپنے نظام چلا سکے سماج میں چھوٹے بڑے کئی گروہ ہوتے ہیں اور ہر گروہ کا ایک رہنما یا سربراہ ہوتا ہے اور گروہ کے ارکان اس کے اصول وضوابط کا احترام کرتے ہیں تاکہ انتشار پیدا نہ ہو اور آپس کا پیار محبت قائم رہے گروہ میں رہنے والے ہر فرد کا رتبہ اور ذمہ داری ہوتی ہے۔

طبقاتی سماج میں دو بنیادی طبقات ہوتے ہیں ایک وہ طبقہ جو کمزوروں کا استحصال کرتا ہے اور دوسرا طبقہ جس کا استحصال کیا جاتا ہے ایک طبقہ ذرائع پیداوزار پر قابض ہوتا ہے اور دوسرا طبقہ محنت کش ہوتا ہے جس کے اختیار میں زرعی پیداوار کی ملکیت نہیں ہوتی ہے قدیم سماج میں ذرائع پیداوار کے پسماندہ تھے تقریبا بارہ ہزار سال پہلے جانوروں کو پالنے سدھارنے اور کاشت کاری کا آغاز ہوا اور اس کی وجہ سے سماج میں معاشی تبدیلیاں ہوئی ہیں خانہ بدوش زندگی کا خاتمہ اور نئی نئی بستیاں آباد ہوئی اور پیداوار میں اضافہ ہوا اس پیداواری اضافے کی وجہ سے طبقاتی نظام کا آغاز ہوا۔ تاریخ پر نظر دوڑانے پر سماج میں بہت سے طبقاتی نظام کا پتہ چلتا ہے جیسے غلام دارانہ سماج جاگیر دارانہ سماج اور سرمایہ دارانہ سماج۔

ظہور اسلام سے پہلے تمام دنیا کی بری حالت تھی اس سماجی ناہمواریاں موجود تھی جیسے عورت پر تشدد نسلی منافرت اور طبقاتی کشمکش انسان اور اسکی جان ومال اور عزت کی کوئی قدر نہ تھی یہ خود کو افضل سمجھتے تھے سپر پاور امپائروں نے سماج کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا امرا، متوسط، اور نچلا طبقہ عرب قبائل میں تعصب کی فضا عام تھی ایک دوسرے کے رسم ورواج میں شریک نہیں ہوتے تھے اسلام کی روشنی پھیلنے سماج کی حالت بدلی اور اسلام کی تعلیمات میں یہ شامل ہے کہ تمام انسان اللہ کی مخلوق ہیں سب برابر ہے اور کوئی بھی حقیر نہیں لیکن عزت وتوقیر تقوی کی بنا پر ہے طبقاتی تقسیم ہر سماج میں موجود رہی اور اس وجہ سے سماج میں لڑائیاں اور قتل وغارت ہوا ملک میں بہت سے رویے اور اصول ایسے ہیں جو طبقاتی تقسیم کا بڑھاوا دیتے ہیں ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی اپنی بلند ترین سطح پر پہنچ چکی ہے غریب غریب تر ہو رہے ہیں امیر اور غریب کے درمیان فاصلہ بڑھتا جارہا ہے ہمارے ہاں سالگرہ ہو یا شادی پیسے کا بے جا اسراف کیا جاتا ہے زیور اور کپڑوں کی خریداری پر لاکھوں خرچ کیے جاتے ہیں اور ان سب باتوں سے معاشرے کے پسے ہوئے طبقے میں الجھن پیدا ہو رہی ہیں جیسے احساس محرومی سماجی ونفسیاتی مسائل اور ان مسائل کی وجہ سے سماجی برائیاں جنم لے رہی۔ معاشرے میں دولت کی مساوی تقسیم سے معاشرے کے بہت سے مسائل پر قابو پایا جاسکتا ہے معاشی ناہمواری معاشرے میں بے روزگاری غربت اور بہت سے مسائل کا سبب بنتی ہے معاشرے میں معاشی طور پر

محفوظ ہوں تو اس سے ملک کی ترقی میں مدد ملتی ہے علم تجربے سے معاشی طریقوں میں تبدیلیاں کی جاسکتی ہے لیکن اگر یہ تبدیلیاں باہر کی دنیا کے تقاضوں کے برابر نہ ہو تو معیشت پیچھے رہ جاتی ہیں اور اس کا اثر ملک میں رہنے والوں پر ہوتا ہے ملکوں کی ترقی کا راز مضبوط معاشی نظام پر ہوتا ہے کہ ابتدا سے آج تک دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف معاشی نظام رہے ہیں سرمایہ دارانہ معاشی نظام اشتراکی معاشی نظام ملا جلا اقتصادی نظام نظام آج تک دنیا کے کئی ممالک میں موجود ہیں۔ امریکہ میں سرمایہ دارانہ نظام کی جھلک دکھائی دیتی ہیں روس اور چین میں اشتراکی نظام کی صورتیں موجود ہے ہیں اور اس طرح کا ملا جلا نظام پاکستان میں موجود ہے ان نظاموں کے فوائد کے ساتھ ساتھ نقصانات بھی ہیں جس کی وجہ سے انسان ایک ایسے نظام کی تلاش میں ہے جہاں سرمایہ دارانہ نظام کی طرح مزدوروں کا استحصال نہ ہو اور نہ اشتراکی معاشی نظام کی طرح شخصی آزادی کا نہ خاتمہ ہو اور نہ بدعنوانیوں کو فروغ ملے، جلے معاشی نظام کی طرح۔

شہناز شورو کا تعلق اندرون سندھ سے ہے وڈیرہ شاہی اور جاگیر داری نظام پر ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے ان کی کہانیوں میں سماج میں موجود طبقاتی نظام اور معاشی ناہمواریوں کے خلاف مزاحمت موجود ہے ان کی کہانیوں میں سماج میں طبقاتی نظام کی وجہ سے ہونے والے مسائل کی نشاندہی موجود ہے اور معاشی نظام کی ناہمواریوں سے جو سماج میں غربت بھوک اور سماجی و نفسیاتی مسائل کی وجہ سے سماجی برائیاں جنم لیتی ہیں ان کا بیان موجود ہے" آخری آدمی "ایسے ہی طبقاتی نظام کی کہانی ہے جہاں امیر طبقہ امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جاتا ہے اس کہانی میں موجود طبقاتی کشمکش کا بیان ہے۔ اس معاشرے میں موجود زندگیوں اور اس کے رہنے والوں میں بہت فرق ہے امیر اپنے گھروں میں سکون سے رہتے ہیں اور نچلا طبقہ نالوں کے کناروں پر کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارتا ہے ان کی زندگی جانوروں سے بدتر ہے معاشرے کے اعلی طبقے کے لوگ جب اس گندے نالے کے قریب سے گزرتے ہیں تو اپنا منہ اور ناک ڈھانپ کر گزرتے ہیں اور قریب رہنے والوں کے بچے اسی نالے میں کھیلتے ہیں ہمارے معاشرے کا تضاد ہے اور افسانہ کشمکش بھی اسی طبقاتی نظام سے پیدا ہونے والے مسائل کا آئینہ ہے اس کہانی میں غریب کی بیٹی پیسے کے زور پر خریدی جاتی ہے اس معاشرے میں جاگیر دار اور وڈیرے اپنی امارت کی وجہ سے شاہ ساٹھ ستر سال کی عمر میں بھی غریب کی جوان بیٹی سے شادی کر جاتے ہیں اور ایک شادی پر اکتفا نہیں کرتے اور بیوی کو ان کے مشاغل میں بولنے کا بھی حق نہیں ہوتا اگر کبھی ان کے کاموں پر سوال اٹھائیں گی تو اس کو یہ کہہ کر چپ کرایا جاتا ہے کہ تم کو اس گھر میں سب کچھ مل رہا ہے اس لئے چپ رہو ورنہ طلاق دے دی جاتی ہے دولت کے زور پر سب کچھ ہوتا ہے معاشرے میں

لوگ یہ نہیں پوچھتے ہیں کہ دولت کہاں سے آئی بس دولت مند ہونا تمام عیبوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور معاشرے میں نچلے طبقہ جب تضاد اور منافقت دیکھتا ہے تو وہ دولت حاصل کرنے کے لیے ناجائز طریقے اپناتا ہے اور معاشرے میں جرائم بڑھ جاتے ہیں ایک افسانہ "ایوزن" ہے جس میں مرد عورت کو اپنے سے حقیر سمجھتا ہے اور اپنا تسلط قائم کرتا ہے اور اس دباؤ کی وجہ سے عورت نفسیاتی کشمکش اور گھٹن کا شکار ہو جاتی "منہ دکھائی اور رونمائی" یہ سماجی ناہمواری کی کہانی ہے ایک لڑکی صائمہ کی کہانی ہے جس نے جب سے اس دنیا میں آنکھ کھولی اپنے ارد گرد بھوک اور غربت دیکھی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترسنا پڑتا ہے صائمہ کے والد ریڑھی لگاتا ہے ایک دن اچانک صائمہ کے لئے امیر گھرانے کا رشتہ آتا ہے گھر والے بغیر تحقیق کے رشتہ منظور کر لیتے ہیں رشتے دار اور محلے والے صائمہ کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ ہمارے سماج میں دولت مند ہونا سب سے بڑی خوبی ہے اور کوئی خوبی ہو نہ دولت مند ہونا چاہیے اور غریب کی خوبی کو بھی پیسے کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے سماج کی اس سوچ سے معاشرے میں برائیاں جنم لے رہی ہے شادی کے بعد صائمہ پر یہ بھید کھلتا ہے کہ کہ اس کا شوہر نامرد ہے اور پھر اس کی ساس اسے اس کے گھر کی غربت یاد دلا کر خاموش کر دیتی ہے اور صائمہ کے ماں باپ بھی نہیں سوچتے ہیں کہ اتنے امیر گھرانے سے اس چھوٹے سے محلے میں ان کی بیٹی کیلئے رشتہ کیوں آیا ہے یہ بھوک سے تنگ آئے ہوئے لوگ کس طرح دولت مند ہونا چاہتے ہیں اور دولت کو سب سے بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔ اسی سوچ کی وجہ سے سماجی قدریں و روایت ختم ہو رہی ہیں اور معاشرے سے اچھی روایات کو زوال اور غلط روایات کا فروغ پا رہا ہے ایک اور افسانہ "وقت کی امر بیل "ہے یہ سماج میں موجود متوسط طبقہ کے بچے اپنے ارگرد ضروریات و خواہشات کا گلہ گھٹتے ہوئے دیکھتے ہیں تو وہ اپنے ذہن میں ایک آسودہ زندگی کے خواب بنتے ہیں ان کے تصورات میں وہ دنیا بسی ہوتی ہے جس میں چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا گلا گھوٹنا پڑے وہ اپنی زندگی میں سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں جن چیزوں کے لئیے ان کا بچپن ترستے گزرا ۔ایسے ہی دو افراد کی کہانی جن کو آپس میں پیار ہو جاتا ہے دونوں یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن لڑکا لڑکی کو یہ کہہ کر انتظار کرنے کا کہتا ہے کہ میں نے کچھ بننا چاہتا ہوں وہ سب پالوں گا تو ہم شادی کر لیں گے لیکن دونوں پیسے کمانے کی دھن میں مصروف ہو کر ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں اور کہانی کے آخر میں جب ان کی ملاقات ہوتی ہے تو ان کے پاس پیسہ تو ہوتا ہے لیکن وقت ہاتھوں سے نکل جاتا ہے۔ بچپن کی محرومیاں ان کی جوانی کھا جاتی ہیں اور یہ سماجی ناہمواری کے سماج میں تنہا رہ جاتے ہیں ۔

ثقافت کسی بھی سماج گروہ اور قبیلے کی تہذیب کا نام ہے ہر گروہ اور قوم اور سماج کی علیحدہ ثقافت ہوتی ہے۔ ثقافت عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ ثقف سے نکلا ہے۔ اور اس کے معنی درست کرنا اور سنوارنا کے ہیں۔ انگریزی میں ثقافت کے لیے کلچر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ثقافت کسی بھی قوم کا اظہار ہے اور سماج میں رہنے والے افراد کا نمونہ پیش کرتی ہے اور ثقافت اقدار کی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے۔ ثقافت ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہے ۔ اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتے ہوئے اس میں تبدیلیاں ہو جاتی ہیں یہ تبدیلیاں سماج اپنی ضروریات کے مطابق کرتا ہے لیکن ثقافت کے ضروری اجزا اور پہلو ویسے ہی قائم رہتے ہیں ثقافت نسل در نسل انسانی تجربات کو جمع کر کے آگے منتقل کرتی ہے اس سے اعلی اقدار بنتی ہیں ثقافتیں لوگوں کے آپس کے میل جول اور تعلقات سے جنم لیتی ہیں جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اپنے کردار وعقائد وعادات سے ایک دوسرے پر اثرات چھوڑتے ہیں اور ثقافت کو پروان چڑھاتے ہیں۔ لوگوں کی عادات، خصلتیں، زبان اور کھانا پینا لباس پہننا سب مل کر ایک ثقافت کا درجہ رکھتے ہیں ثقافت کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے اور کسی بھی معاشرے کے لیے روح کا درجہ رکھتی ہے۔ علوم و فنون، اخلاقی و معاشرتی، رسوم افکار و عقائد سب ثقافت کا حصہ ہمیں اپنی زندگی میں روایات، اقدار اور ثقافت کی ضرورت ہوتی ہے زندگی کا رہن سہن، میل جول، انداز گفتگو، کھیل، شادی بیاہ کی رسومات سب ثقافت کا حصہ ہیں اور زندگی میں میل جول اور رسم و رواج سے اتحاد قائم ہوتا ہے۔ ہماری زندگی کے روزمرہ کے کام ہماری خواہشیں، ہماری ضرورتیں، احساسات، محبتیں اور نفرتیں یہ سب مل کر ہماری ثقافت بناتی ہیں اس کے علاوہ اس علاقے کے موسم، کھیل کود اور شادی بیاہ کی رسمیں سب ثقافت ہیں۔ ثقافت تاریخی طور پر ایسا خاکہ ہیں جن میں انسان اپنے عمل و دخل، ضروریات، تحفظ اور میری ملاقات سے رنگ بھرتا ہے اور افراد کی کردار سازی کرتا ہے۔

ثقافت رسم و رواج میں صرف ناچ گانے اور تفریح کا ہی نام نہیں بلکہ نہایت سنجیدہ عمل بھی ہے اور اس کا فلسفہ حیات مثبت ہے جس میں جمالیاتی اقدار اور سیاسی و معاشی اقدار کا حسین امتزاج ہو اور انسان کے ظاہر و باطن کی تربیت بہتر انداز میں ہو سکے۔ ان سب سے انسان میں پاکیزگی اور اجتماعیت کا احساس ہوتا ہے اور زندگی مقصدیت پاتی ہے اس کے علاوہ انسان کا عملی پہلو بے حد اہم ہیں جس کو کردار کہتے ہیں۔ کردار انفرادی اور معاشرتی ہوتا ہے جب بچہ دنیا میں آتا ہے انفرادیت رکھتا ہے پھر بچہ اپنے ماحول سے سیکھتا ہے

خاندان اور دوسرے افراد سے تعلق کس کا کردار بناتا ہے۔ ثقافت دو قسم کی ہوتی ہے۔ مادی اور غیر مادی ثقافت۔

مادی کی ثقافت میں شامل اشیاء طبعی خواص رکھتی ہے ان میں گھر، فرنیچر، اوزار، سڑکیں، مشین اور آلات وغیرہ شامل ہیں۔ غیر مادی ثقافت میں جو اشیا شامل ہوتی ہیں وہ جسم نہیں رکھتیں وہ انسانی تخلیقات ہے جیسے عقائد، روایات، اقدار، زبان اور معیارات شامل ہیں۔ معیارات کے ذریعے معاشرہ اس میں بسنے والوں کی طرز عمل کی رہنمائی کرتا ہے۔ قدریں عمل کے اصول ہیں جو ہمیں غلط اور صحیح میں تمیز سکھاتی ہیں ہر ثقافت کی اپنی قدریں ہوتی ہے عقائد خاندان سے ہی سیکھے جاتے ہیں اور نسل در نسل چلتے ہیں یہ عقائد مذہبی بھی ہوتے ہیں یہ وہ باتیں ہوتی ہیں جو سالہاسال سے چلی آرہی ہوتی ہیں اور سچ ثابت ہوتی ہیں لوگوں کا ان پر یقین ہوتا ہے۔

زبان کسی بھی معاشرے کی پہچان ہوتی ہے یہ علامات کا نظام ہے جو آپس میں بات کرنے اور دوسروں سے روابط رکھنے میں مدد دیتا ہے دنیا کی ہر تہذیب نئی ہو یا پرانی اس میں چار عناصر ترکیبی شامل ہوتے ہے۔

۱۔ سماجی اقدار

۲۔ فکر و احساس

۳۔ طبعی حالات

۴۔ آلات و اوزار

یہ عناصر ہر تہذیب میں شامل ہوتے ہیں سرد علاقے ہوں یا گرم مشرق ہو یا مغرب کوئی فرق نہیں ہوتا یہ چار عناصر ترکیبی ہر تہذیب کا حصہ ہوتے ہیں۔ اقدار وہ اصولوں و قوانین ہیں جو افراد کو بہترین انسان بننے میں مددگار ہوتے ہیں اقدار ہماری ترجیحات بناتی ہے یہ عقائد انسان کو دو انسانوں اور دو صورتحال کے درمیان انتخاب کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں اقدار لاطینی لفظ والیر سے ہے اس کے معنی مضبوط ہونا ہے یہ وہ اصول اور خوبیاں ہیں جن کو کسی بھی معاشرے میں عزت و توقیر حاصل ہوتی ہے اور یہ معاشرے کی پہچان ہوتی ہے۔ یہ قدریں اصول و قوانین کے ذریعے نافذ نہیں ہوتیں بلکہ ان اقدار کے پیچھے صدیوں کی تاریخ روایات افراد کی محنت، تجربہ اور مشاہدات شامل ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگ اپنی اقدار پر سختی سے عمل پیرا ہوتے تھے اور ان کو نہ ماننے والوں کو اپنے قبیلے اور برادری سے نکال دیتے تھے اور برادری اس شخص

سے ہر قسم کا ناطہ توڑ لیتی تھی۔ ان باتوں کے خوف سے لوگ اقدار سے انحراف نہیں کرتے تھے اور اپنی اقدار کی سختی سے پیروی کرتے تھے۔

دنیا کا کوئی بھی خطہ جہاں بنی نوع انسان معاشرے یا بستی بساتا ہے وہیں پر ثقافت کا آغاز ہو جاتا ہے تمام لوگ مل کر اپنی روایات وعقائد اور عمل سے اقدار بناتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں ثقافت کسی معاشرے کی روحانی نفسیاتی اور معاشرتی اثاثہ ہوتی ہے ثقافت کی دو صورتیں ہیں ایک ظاہری دوسری باطنی۔ معاشرہ جن چیزوں کو اچھا سمجھتا ہے ان کی قدر کرتا ہے اور پھر یہی اچھی باتیں قدر کہلاتی ہیں کچھ قدریں ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہیں جیسے مہمان نوازی، صاف گوئی، رحمدلی، مظلوم سے ہمدردی وغیرہ اس کے علاوہ بزرگوں کا احترام کرنا چھوٹوں سے پیار کرنا شادی پر خوشی منانا کسی کی موت پر غم اور افسوس کرنا وغیرہ۔ معاشرے میں امن و سلامتی کی فضا اچھی اقدار کے فروغ سے قائم ہو سکتی ہے اور غلط اقدار کو معاشرے سے ختم کرنا ضروری ہے جو ناسور کی طرح ہمارے معاشرے میں پھیل رہی ہیں۔ شادی بیاہ یا اور دوسرے مواقع پر پیسے کا اسراف، معاشرے میں دولت کی نمائش، جہیز کی لعنت، ان سب سے کم آمدنی والے طبقات میں احساس محرومی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں رسم و رواج و اقدار پر ہر ثقافت کا حصہ ہے ان میں سے زیادہ تر رسمیں انسان نے اپنی ضرورت کے تحت بنائیں اور پھر یہ رسمیں رفتہ رفتہ معاشرے کا حصہ بن گئیں انسان کی فطرت ہے کہ وہ جلد اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے یہ رسمیں انسان کی زندگی کو جمود کا شکار نہیں ہونے دیتیں بعض رسمیں موسم کے بدلنے پر فصلوں کی کٹائی پر ادا کی جاتی ہیں اور تفریح مہیا کرتی ہیں۔

انسان جو کچھ بچپن سے سیکھتا ہے اس میں خوشی محسوس کرتا ہے اور اس کو پسند کرتا ہے اس لیے ہر قوم اپنے ملک کے رسم ورواج کو پسند کرتی ہے اور اپنی رسموں کو دوسروں کی رسموں کے مقابلے میں بہتر جانتی ہے برصغیر میں مسلمان تہذیب سے اس علاقے پر گہرے اثرات مرتب ہوئے رہن سہن اور پہناوے کے علاوہ ان کے کھانے بھی یہاں کے لوگوں کو پسند آئے برصغیر میں آنے والے حکمرانوں نے رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے محلوں میں ہندو تہواروں کو منایا اور ہندو عورتوں سے شادیاں بھی کیئں ان اقدامات سے مسلمانوں کے عقائد میں تو کوئی تبدیلی نہ آئی لیکن سماجی طور پر اثرات کو قبول کیا اور بہت سی رسموں کو اپنالیا اور یہ اثرات آج بھی ہمیں اپنے معاشرے میں دکھائی دیتے ہیں رسم ورواج معاشرے کی قبول روایات ہوتی ہیں اور افراد اپنی حدود میں رہتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں اگر افراد ان روایات پر عمل نہ کریں تو ان کو معاشرے کے دوسرے افراد کے غصے اور نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے رسم ورواج پر مذہب، اور قانون کا اچھا

خاصا دخل رہتا ہے اور اس کے نہ ماننے والوں کو جسمانی یا مالی سزا بھی ہو سکتی ہے۔ ہندو معاشرے میں ایک شادی کا رواج ہے لیکن عرب معاشرے میں کئی شادیاں کی جاتی ہیں اور ایک شادی کرنے والے کو عجیب نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ بر صغیر میں ایک بڑے عرصے تک مسلمان ہندو کے ساتھ رہے اور ان پر ایک دوسرے کی رسومات کا اثر ہوا اور اس کے اثرات آج تک ہمارے معاشرے پر قائم ہیں ہمارے ہاں شادی پر اسراف مہندی مائیوں پر ناچ گانا اور جہیز جیسی رسمیں معاشرے میں بہت سے مسائل پیدا کر رہی ہیں۔

شہناز شورو کے افسانوں میں ثقافتی عناصر کے خلاف مزاحمت موجود ہے۔ "لوگ لفظ اور انا" یہ افسانہ سماج کے منافق رویوں پر مبنی ہے اس کہانی کے دو کردار فوزیہ اور کمال ہیں اور یہ اپنی شادی کے بعد دوسرے شہر نوکری کے سلسلے میں جاتے ہیں اور سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں فوزیہ ایک تعلیم یافتہ آزاد خیال لڑکی ہے۔ فوزیہ کمال دونوں خوشی سے رہنے لگتے ہیں لیکن ان کے محلے والے ان کی ہنستی بستی زندگی میں آگ لگا دیتے ہیں فوزیہ اور کمال اپنے گھر بیڈ منٹن کھیلتے ہیں لیکن محلے والوں کو یہ پسند نہیں کہ وہ کھیلیں ان کے مطابق یہ واہیات کھیل ہے ان کا کہنا ہے کہ ان کی بہو بیٹیاں یہ کھیل نہیں کھیلتیں۔ کمال کے گھر میں کیبل لگی ہوئی ہے محلے والے ان سے اس کی تار مانگتے ہیں یہاں دہرا منافقانہ رویہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ان کو فوزیہ کا کیبل دیکھنا برا لگتا ہے ان کے خیال میں ان کی بہو بیٹیاں بگڑ جائیں گئی۔ محلے والے اپنے کام سے کام نہیں رکھتے دوسروں کے گھروں میں تانک جھانک کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں غرض محلے داروں کو فوزیہ کہ ہر عمل پر اعتراض ہوتا ہے محلے کے ایک صاحب کی دو بیواں ہیں اور وہ اپنی بیوی کو خرچ نہیں دیتے مارتے پیٹتے ہیں وہ لوگوں کے کپڑے سلائی کر اپنا گزارہ کرتی ہے جب ان کی بیوی طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو اپنی غلطی ماننے کی بجائے فوزیہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں اور اس طرح محلے والوں کی بے جا مداخلت کی وجہ سے ایک ہنستا بستا گھر اجاڑ جاتا ہے۔

"حویلی" افسانہ میں اندرون سندھ کی کہانی ہے اس سماج میں پھیلی ہوئی غلط اقدار، پیری فقیری اور تعویذ گنڈے کی روایات اور لڑکیوں کا جائیداد کو بچانے کی خاطر قران سے شادیاں کرنا۔ اور پھر ان قرآن سے بیاہی لڑکیوں کی زندگی کی کہانی ہے۔ اس افسانے مین ان لڑکیوں کی زندگی معاشرے کی غلط روایات کے خلاف مزاحمت ہے۔ جس کو شہناز شورو صاحب نے بہت عمدگی سے لکھا ہے آگے چل کر کہانی میں ان لڑکیوں کے نفسیاتی اور جسمانی مسائل کا تذکرہ ہے ہمارے معاشرے میں اچھی اقدار کا زوال اور غلط اقدار شامل ہو چکی ہے جن کا سدباب بہت ضروری ہے۔

"فطرت اور روایت" اس کہانی میں معاشرے میں موجود وٹے سٹے کی شادی کے مسائل اور ان کے خلاف مزاحمت موجود ہے۔ اس کہانی کے دو کردار امیر اور سبھاگی ہیں دونوں کا رشتہ ماموں کے گھر بچپن سے وٹے سٹے سے طے ہوا ہوتا ہے سبھاگی کا منگیتر بیمار ہو کر فوت ہو جاتا ہے اور سبھاگی کی کہیں شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ امیر کی منگ تھی اور اس کے نام پر زندگی گزارنا اس کی مجبوری ہے اور امیر کی منگنی اس لیے ٹوٹ جاتی ہے کہ اب اس کے بدلے میں کوئی اور شادی نہیں ہو سکتی امیر کو بھی برادری سے کوئی رشتہ نہیں دیتا کیوں کہ امیر کے بدلے میں کوئی اور رشتہ اس کے گھر میں نہیں ہے لیکن یہ پیسے والے لوگ ہیں امیر کو جب برادری رشتہ نہیں دیتی تو باہر سے لڑکی پیسوں کے عوض بیاہ لاتے ہیں اور سب بہت خوش ہوتے ہیں اور یہ فخریہ گاؤں کے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ہم نے اس کو لاکھوں میں خریدا ہے اور سبھاگی کنواری ہی رہ جاتی ہے اور اس کی کہانی میں ذہنی و جسمانی کیفیت کا بیان ہے جس سے وہ گزر کر غلط راہ پر چل پڑتی ہے ان کے بہت سے افسانوں میں سماج میں پھیلی رسم و رواج کے خلاف مزاحمت موجود ہے جیسے کاروکاری اس افسانے میں غیرت کے نام پر معصوم بچیوں کو بلاوجہ قتل کر دیا جاتا ہے۔

"پہلا کمرہ تیسری عورت" میں پیری فقیری کے پردے کھیلے جانے والے کھیل اور معاشرے میں مرد اپنی نامردی کو چھپانے کے لئے کیسے عورت کا سہارا لیتا ہے اور معاشرے میں کیسے ناک اونچی کر کے پھرتا ہے۔

ب۔ تحقیقی نتائج

۱۔ اس تحقیق کے تمہیدی مباحث میں مزاحمت اور مزاحمتی عناصر کو واضع کرنے کی کوشش کی گئی ہے شہناز شورو کے افسانوں میں مزاحمت کی جو صورتیں موجود ہیں ان میں انفرادی مزاحمت، اجتماعی مزاحمت، داخلی مزاحمت اور خارجی مزاحمت نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں "کشمکش"، "باولی"، "پناہ" میں سماجی اور معاشی استحصال اور استحصال اور ان میں پسے ہوئے لوگوں کی روداد اور ان استحصال زدہ لوگوں کی مزاحمت کی مختلف صورتیں موجود ہیں۔ افسانہ نگار نے تفصیلاً ان کو اپنے خاص اسلوب میں بیان کیا ہے۔

۲۔ آخری آدمی، رانی باجی، لا اکرام فی الدین ان افسانوں میں طبقات میں بٹے معاشرے کا وہ عکس دکھایا ہے جہاں ایک طبقہ اپنے مفاد کے لیے نچلے طبقے کا کیسے استحصال کرتا ہے اور استحصال زدہ لوگوں کی

مزاحمت کا بیان موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں سماجی اقدار، فکر و احساس، طبعی حالات اور ثقافتی جبر کے تحت مزاحمتی رویے ملتے ہیں۔

۳۔ ان کے افسانوں میں ثقافتی عناصر، رسم و رواج، غلط روایات و اقدار کیسے مسائل کا سبب بنتے ہیں اور ان مسائل میں گھرے لوگ کیسے مزاحمت کرتے ہیں ان سب کا بیان ان افسانوں بازیافت، حویلی، منہ دکھائی، لہروں کی دھوپ میں بہت عمدگی سے موجود ہے۔

۴۔ ان کے افسانوں میں معاشرہ کیسے سماجی اور ثقافتی طور پر مسائل پیدا کرتا ہے اور ان مسائل میں گھرے لوگوں کے رویوں پر کیسے اثرانداز ہوتا ہے اور ان کے رویئے کیسے مزاحمت کرتے ہیں ان سب کا بیان بہت عمدہ ہے۔

ج۔ سفارشات

درج بالا تحقیق کی روشنی میں مندرجہ زیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں

۱۔ شہناز شورو کے افسانوی مجموعوں پر اسلوبیاتی حوالے سے بھی تحقیقی کام کیا جاسکتا ہے

۲۔ شہناز شورو کے افسانوں کا دوسرے ادیب وافسانہ نگاروں کے افسانوں کا تقابل کیا جاسکتا ہے

۳۔ شہناز شورو ایک مترجم بھی ہیں۔ ان کے تراجم کے حوالے سے بھی کام کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

الف۔ افسانوے مجموعے

شہناشورو، لوگ لفظ اورانا، مشال پبلشرز امین پورہ فیصل آباد، ۱۹۹۷ء

شہناز شورو، زوال دکھ، مشال پبلشرز امین پورہ فیصل آباد، ۲۰۰۵ء

ثانوی مآخذ

ارتظیٰ کریم، اردو ادب میں احتجاج اور مزاحمت کے رویئے، اُردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۴ء

اسلم جمشید پوری ڈاکٹر، ترقی پسند اُردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار، ماڈرن پبلیکشنز ہاؤس دہلی، ۲۰۰۲ء

انوار احمد ڈاکٹر، اُردو افسانہ تحقیق و تنقید، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۰ء

انوار احمد ڈاکٹر، ایک صدی کا قصّہ، اُردو افسانہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

انور سدید، اُردو افسانہ عہد بہ عہد، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۲ء

انور سدید، ثقافتی انسانیت، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۸ء

انور سیدید، اُردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۹۹ء

جمیل جالبی، معاصر ادب، سنگ میل پبلیکشنز لاہور، ۱۹۹۱ء

رشید امجد، پاکستانی ادب ۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۸ء اکادمی پاکستان، ۲۰۰۹ء

رشید امجد، پاکستانی ثقافت، اکادمی ادبیات اسلام آباد پاکستان، ۱۹۹۹ء

رشید امجد، مزاحمتی ادب (۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۷ء) اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۹ء

روبینہ سہگل، عورت اور مزاحمت، مشعل عثمان بلاک نیو گارڈن ٹاون لاہور، س ن

سبط حسین، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال عبد اللہ ہارون روڈ کراچی، ۱۹۸۹ء

شہر مرتضیٰ مطہری، سماج اور تاریخ، سازمان تبلیغات اسلامی ربط بین الملل ۱۴۱۰ھ

شیاما چرن دوبے، سماج شناسی، نیشنل کونسل آف ایجوکیشن نئی دہلی، ۱۹۷۸ء

طارق کلیم ڈاکٹر، اُردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۱۸ء

عبد القادر عمادی، ابتدائی سماجیات، ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی، س ن
عتیق ارحم، ادب میں احتجاج ابتدا سے انیسویں صدی تک، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۷ء
قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، اسلام آباد بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵ء
کنور محمد اشرف، ہندوستانی معاشرہ عہد وسطی میں، نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی، ۱۹۷۴ء
گوپی چند نارنگ ڈاکٹر، اُردو افسانہ روائیت اور مسائل، ایجوکیشنل پبلیکشنز ہاؤس نئی دہلی، ۲۰۱۳ء
مرزا حامد بیگ، اُردو افسانے کی رویت (۱۹۳۰ء تا ۲۰۰۹ء) دوست پبلی کیشنز کراچی، ۲۰۱۰ء
مسز فرخ جاوید، عمرانیات، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۷۹ء
مظہر حسین ڈاکٹر، اقبال اور ثقافت، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۴ء

رسائل جرائد

الماس، شاہ عبد الطیف بھٹائی یونیورسٹی خیر پور سندھ، شمارہ 17,170، ۲۰۱۶ء
دارالعلوم، ماہنامہ، مولانا محمد اللہ قاسمی، شمارہ، ۲ جولائی ۲۰۱۸ء
سلسلہ، (سہ ماہی) سلسلہ پبلیکشنز گلشن اقبال کراچی، شمارہ ۹۰، اگست ۲۰۰۶ء

انٹرنیٹ مواد

http://www.raikhta.com
http://www.Jangpk.com
http://www.urdulinks.com